تین پیسے کی چھوکری!

قاضی عبدالغفار

مکتبہ اردو لاہور

تین پیسے کی چھوکری

قاضی عبدالغفار

مکتبۂ اردو لاہور

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشرز چھپ کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوئی

فہرس

دیباچہ

یہ سب کسی زمانہ کے چند کفنائے ہوئے مُردے ہیں جن کو ان اوراق میں دفن کرتا ہوں!

مَیں افسانہ نگار کبھی نہ تھا، نہ ہوں، کبھی کبھی سرِ راہ قلم کچھ دائرے اور زاویئے ایسے بنا دیتا ہے! فن کے اعتبار سے نوک و پلک پر غور نہ کیجیے۔ وُہ تنقید و تبصرہ کے حریف نہ ہو سکیں گے!

یہ جو کچھ ہے منظم افسانہ نگاری نہیں ہے بلکہ ایک انتشار ہے —— مصوّر، ناقد اور مبصر سے زیادہ میں اپنے حال سے واقف ہوں اور وُہ یہ ہے کہ:-

انشا پردازی کے لحاظ سے مَیں فن کے ہر شعبہ پر حاوی ہوں —— سوائے

انشا پردازی کے! ـــــ بحیثیت افسانہ نگار کے میں سب کچھ لکھ سکتا ہوں ـــــ سوائے افسانہ کے! ـــــ بحیثیت ایک ادیب کے میرا قلم فن کے ہر پہلو پر حاوی ہے ـــــ سوائے ادبیات کے! ـــــ اس "آغازِ کلام" کے بعد "خاتمہ کلام" جو کچھ ہوگا، وہ ظاہر ہے!

اہلِ ذوق سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ افسانے ان کے قابل نہیں اس لئے کہ ـــــ نہیں ہیں! اگر نقادانِ سخن اور اہلِ فن ان اوراق کو بنظرِ تنقید دیکھنے کا ارادہ کرینگے تو میرے گھبرائے ہوئے ضمیر کی بے اطمینانی کچھ اور بڑھ جائیگی!

حقیقت صرف یہ ہے کہ یہ اوراقِ پریشاں صرف اُن اصحاب کے پڑھنے کے قابل ہیں اور ان ہی سے میں ان اوراق کو منسوب کرتا ہوں جو میری طرح افسانہ لکھ نہ سکتے ہوں مگر لکھنے ضرور ہوں! ـــــ اور اس قسم کے میرے ساتھی بہت ہیں! اُن کی کثرت میں میں اپنے ان "شاہکاروں" کو بالکل محفوظ سمجھتا ہوں!!

حیدرآباد
۲۸ر جنوری ۱۹۲۴ء

عبدالغفار

تین پیسے کی چھوکری

(۱)

آج سے پندرہ سو برس پہلے!

بائی زنطہ کے شاہی سرکس میں، بادشاہ کے وحشی جانوروں کا داروغہ ایک بڈھا شخص تھا، بہت بوڑھا، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار، اُس نے اپنے بڑھاپے کا سہارا ایک بارہ سالہ چھوکری کو بنا لیا تھا۔ جس کو نہ معلوم وُہ کہاں سے لایا تھا۔ وُہ نہ اُس کی بیٹی تھی نہ پوتی نہ رشتہ دار، نہ اُس کی ہم وطن، لیکن اُس نے مُنہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور بیٹی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس چھوکری کی قوم کیا ہے۔ اُس کا مذہب کیا ہے اور وُہ کس طرح بڈھے کے پاس پُہنچی؛

بائی زنطہ کے عظیم الشان دار السلطنت میں شہنشاہ جسٹینن کا پرچم اقبال بلند تھا۔ اُس زمانہ کی تہذیب اور بائی زنطی مخلوق کا تمدن، خصوصاً امراء اور عمائدین کی معاشرت یونان و روما کی قدیم تہذیب سے بھی دس پانچ قدم آگے تھی!

شہنشاہ اور اُس کے امراء و ارکین سلطنت کے اسباب تفریح و تعیش میں سے ایک یہ سرکس بھی تھا جس میں ہزاروں قسم کے وحشی اور جنگلی جانور پالے جاتے تھے۔ ۱۲ برس کی چھوکری کو دُنیا میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ سرکس کے درندوں میں صبح سے شام تک کھیلتی رہتی۔ وُہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی، اور دل اُس کا ایسا ہی بیخوف تھا جیسا کہ وحشی درندوں کا، اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوف کس چیز کا نام ہے۔ وُہ شیروں کی ایال پکڑ کر لٹک جاتی تھی اور دوپہر کو کھیلتے کھیلتے اکثر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اُس کی دُنیا میں اُس کے رفیق اور دوست ہاتھی اور ریچھ ہی تھے!

دن بھر بڈھا سرکس کے جانوروں کی خدمت میں مصروف رہتا اور چھوکری اپنے کھیل میں، شام کو وُہ دونوں گھر چلے جاتے۔ مگر ایک دن شام کو چھوکری سرکس سے تو چلی گئی، لیکن گھر نہ پہنچی۔ رات بھر بڈھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ رات بھر وُہ غائب رہی صبح کو وُہ ہنستی ہوئی گھر آئی اور بڈھے کے ہاتھ پر تین چمکتی ہوئی اشرفیاں رکھدیں! یہ اسکے حُسن کا پہلا سودا تھا! یہ اُس کی جوانی کا پہلا منافع تھا! گذری ہوئی شام اور موجودہ صبح کے درمیان، گذشتہ شب کی تاریکی میں بڈھے کی چھوکری عورت بن گئی!

راتوں کو غائب رہنے کا سلسلہ جاری رہا اور سرکس کے درندوں کے ساتھ جو کھیل کود ہوا کرتا تھا۔ وہ اب دوسری قسم کے حیوانوں کے ساتھ کھیلا جانے لگا! یہ آغاز تھا ملکہ بازنطہ کی حکومت کا!

تھوڈورا کی جوانی اب ہر طرف سے آنکھوں، نظروں اور دلوں کو کھینچ رہی تھی۔ وہ شاہی سرکس میں ناچا کرتی تھی اور بازنطہ کے ہزار ہا نظر باز ہر شام کو اس کے حسن کی خاطر سرکس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ شاہی دربار کے رکن رکین لشب و جلیس نے تو ایک دن تھوڈورا کو ناچتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا۔
"گھاس کا یہ بھد کتا ہوا کیڑا کسی دن سارے بازنطہ میں اچھلیگا — دیکھنا!"
لیکن اس وقت لشب کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! ستم ظریفیٔ قدرت اس ناچنے والی کو نہ معلوم کہاں سے کہاں تک اچھالنے والی تھی!

تھوڈورا سرکس کے نظر بازوں سے تھک گئی۔ ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اسکو کبھی بھاتا نہ تھا۔ اب وہ منظرِ عام پر تھرکنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی۔ حسن فروشی اس عہد کی تہذیب میں کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی بلکہ حسن و ہوس کے یہ کھیل تماشے تو بازنطی تہذیب کے جزو لازمی تھے۔ امراء طوائف الملوک کی نگہ التفات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اور عوام کی زندگی ان رنگین تتلیوں کے بغیر بے

رنگ ہو جاتی تھی۔ حسین تھیوڈورا اپنی دوکانِ حُسن کھولتے ہی، دلوں کی مالک، آنکھوں کا تارا، کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی۔ اُمراء اُس کے سنگِ آستان پر جبینِ نیاز رکھتے، دل چلے سپاہی اور میدانِ جنگ کے سُورما اُس کے اشارۂ ابرو کا انتظار کرتے۔ اُن کی خوں آشام تلواریں اُس کے قدموں میں پڑی ٹھوکریں کھایا کرتیں! اہلِ علم اور اہلِ مذہب بھی اُس دیوی کے استھان پر سر جھکاتے تھے اور سرکس کی ناچنے والی چھوکری بائی زنطہ کی حُسن پرست دُنیا میں ایک "ملکۂ عالم" تھی کہ اس کا سکہ ہر طرف جاری تھا!

نوجوان شہنشاہ جسٹینین بارہا اُس کو تھیٹر میں ناچتے، باغوں میں اٹھکیلیاں کرتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجومِ عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا۔ اُس کے دل میں خلش تھی۔ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔

ایک شب شہنشاہ نے اپنے محافظ دستہ کے کپتان کو موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار دے کر تھیوڈورا کے گھر بھیجا اور پیام دیا کہ وُہ شاہی خلوت میں آئے۔ آدھی رات کے قریب شاہی کپتان تھیوڈورا کے دروازے پر آیا۔ اُس وقت تھیوڈورا کی خلوت میں اس کا کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ اُس نے کپتان کو گھر کے اندر نہ بُلایا۔ بلکہ خود دروازے پر آگئی۔ شہنشاہ کا پیام سُنکر اُس نے کہا:۔

"شہنشاہ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ، مگر یہ ہار واپس لیجائیے۔ میں بکاؤ نہیں ہوں، شہنشاہ سے کہدیجئے کہ اس ہار سے کسی دوسری حسین چھوکری کا حُسن خریدیں

لیں ـــــ میری قیمت اس ہار سے بہت زیادہ ہے"!

اب وُہ سرکس کی بجائے ایک عظیم الشان سلطنت کے شیر اور ہاتھی سے بےخوف ہو کر کھیل رہی تھی!!

اُسی شب پھر ایک شاہی مصاحب، شہنشاہ کا پیام، بہت سے تحائف اور اکرام و الطاف کے بہت سے وعدے لیکر آیا۔ تھوڈورا نے دوسرا پانسہ پھینکا:۔

"شہنشاہ سے کہدیجیئے کہ وُہ اس کنیز کے طالب ہیں تو اُسکے سیاہ خانہ پر تکلیف فرمائیں" بانئ زنطہ کے شہنشاہ سے جسکی خاکِ پا بادشاہوں اور گردن کشوں کی سجدہ گاہ تھی یہ گستاخانہ سوال و جواب، موت سے کھیلنا تھا مگر تھوڈورا نے بہت بڑی بازی لگائی تھی ـــــ

شب کی آخری ساعتوں میں بالآخر شہنشاہ خود اُس کے دروازے پر آیا جس وقت وُہ اندر داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ تھوڈورا ایک صلیب کے سامنے جھکی ہوئی عبادت میں مشغول ہے! بہت دیر بعد اُس نے اس طرح کہ وُہ گویا کسی دوسرے عالم میں ہے، نظر اُٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا:

"تم ہی تھوڈورا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا

"ہاں حضور! میرا نام تھوڈورا ہے۔ مَیں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی"۔

"تم وہی ہو جس کو ہر ملاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے" ، شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے!

تھوڈورا نے کہا:۔

"جی ہاں! میں وُہی ہوں!"

"پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو؟" اب جسٹینین کا غصہ تیز ہوتا جاتا تھا!

"حضور!" تھوڈورا نے دست بستہ عرض کیا "ملّاح کے پاس میں اسلئے جاتی ہوں کہ اُس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں اور وُہ سب میں لے لیتی ہوں۔ وُہ تین پیسے دیکر اپنا سارا سرمایہ مجھے دے ڈالتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے چاہنے والوں سے جو کچھ ان کے پاس ہو۔ سب ہی لے لیتی ہو؟"

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری قیمت ہے!"

"تو پھر تم مجھ سے کیا مانگتی ہو۔"

"آپ کا تاج و تخت! اے بائی زنطہ کے شہنشاہ!"

اس طرح چند روز بعد یہ تین پیسے کی چھوکری "شہنشاہ بائی زنطہ کی مشہور عالم ملکہ تھوڈورا بن کر، اُس زمانہ کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک بنی!

وُہ اپنا حُسن بیچتے بیچتے ملکۂ عالم بنی اور ملکۂ عالم بن کر جب اُس کو حُسن فروشی کی ضرورت نہ رہی تو اُس نے بائی زنطہ کے خوبرو جوانوں کی جوانی خریدنا شروع کر دی اُس کی ہوس پرستی کی داستانیں اُسی قدر مشہور ہیں جس قدر اُس کا حُسن!

(ب)

مسیح کی پیدائش کے پانچ سو برس بعد!
بائی زنطہ کے دارالسلطنت میں
شہنشاہ جسٹنین اور اسکی عیش پرست ملکہ تھوڈورا کا زمانہ

بائی زنطہ کی شاہراہ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شہنشاہ اور ملکۂ عالم کی رعایا سڑک کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جمع ہے۔ یہ وُہ سڑک ہے جو شاہی محل سے ایا صوفیہ کو جاتی ہے۔ دو رویہ سپاہی کھڑے ہیں۔ سپاہیوں کے عقب میں اہل شہر، امرا، و رؤسا ء

سب ملکۂ عالم کی سواری کے منتظر ہیں؛

ہفتہ میں ایک دفعہ ملکہ تھوڈورا۔ ایا صوفیہ میں عبادت کرنے جایا کرتی ہیں۔ یہ جلوس قابلِ دید ہوتا ہے۔ ملکۂ عالم کے شاندار جلوس کو دیکھنے والے گھنٹوں پہلے سے سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں اور دارالسلطنت میں ہفتہ کا یہ ایک دن گویا ایک عام یومِ تعطیل ہوتا ہے —— وہ ملکۂ عالم کی عبادت کا دن ہے!!

دیگیریا کے محافظ دستہ کا ہراول ہر سُرخ وردیاں پہنے، شاندار گھوڑوں پر سوار آہستہ آہستہ چلا آتا ہے۔ سواروں کی وردیاں اور ان کے چمکتے ہوئے اسلحہ دھوپ میں اس قدر چمک رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں —— اس دستہ کے پیچھے ایک مرصع تخت رواں ہو اور اُس تختِ رواں پر ایک مطلاء شامیانہ کے نیچے ملکۂ عالم تشریف رکھتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے امراء اور اراکینِ سلطنت کی نوجوان اور حسین لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لئے ہوئے اور آٹھ چھوکریاں ہاتھوں میں چاندی کی گھنٹیاں لئے ہوئے چل رہی ہیں۔ چاندی کی گھنٹیاں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بجائی جاتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے شاہی منصب دار قرمزی رنگ کا لمبا کپڑا بچھاتے ہوئے آتے ہیں اور ملکہ کی سواری جب اُس کپڑے پر گذر جاتی ہے تو اُس کو لپیٹ لیتے ہیں منصبداروں کی جماعتیں یہ خدمت انجام دیتی آتی ہیں تاکہ ملکۂ عالم کے تختِ رواں کا سایہ ناپاک زمین پر نہ پڑنے پائے!

تختِ رواں، جواہر اور سونے چاندی کی ضیاکاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اُس کی چمک میں سُورج کی شعاعوں نے گویا آگ لگا دی ہے —— اس

طرح بائی زنطہ کی ملکہ، دو رویہ خلائق کے سلاموں کا جواب سر کے اشارے سے دیتی ہوئی مسیح کی درگاہ میں جا رہی ہے —

سلطنت کے دیہاتی علاقہ کا رہنے والا ایک خوبصورت نوجوان استیف جو چند روز ہوئے دارالسلطنت کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس وقت ایک کنوئیں کی دیوار پر کھڑا ہوا شاہی جلوس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اُس کے قریب اُس کا ایک شہری دوست کھڑا ہے۔ سواری قریب آ گئی۔ دفعتہً ملکۂ عالم کی نظر اس دیہاتی نوجوان پر پڑی مگر وُہ نہ سمجھا، وُہ سمجھا کہ یہ غلط انداز نظر بر سرِ راہ تھی۔ مگر وُہ خوش تھا کہ آج اُس نے ملکۂ عالم کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بادشاہوں کا دیدار عقیدت مند رعایا کے دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتا ہے!

استیفن بیچارے نے اپنی عمر میں پہلے کبھی شاہانہ طنطنہ کا یہ مظاہرہ کب دیکھا تھا! وُہ اس نظارہ میں محو تھا کہ ملکہ کی سواری بالکل اُس کے سامنے آ گئی —— ایک لمحہ کے ہزارویں حصّہ میں اُس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اُس کی نظر ملکۂ عالم کی نظر سے ملی۔ گھبرا کر اُس نے نظریں نیچی کر لیں —— اتنی ہی دیر میں سواری آگے نکل گئی۔ استیفن کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس کو پسینہ آ گیا تھا!

شاہی سواری کے پیچھے پیچھے ایک منصب دار چاندی کے پھول لٹاتا ہوا جا رہا تھا غریب اور امیر بڑھ بڑھ کر اُن پھولوں کو لوٹ رہے تھے۔ جس کے ہاتھ ایک پھول آ گیا۔ اُسکو

گویا بڑی سعادت نصیب ہوئی منصبدار جب بڑھتے بڑھتے استیف کے قریب پہنچا تو اُس نے اپنا ہاتھ لوگوں کے اُوپر سے استیف کی طرف بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کے پھُول اور ایک تازہ گلاب تھا۔ استیف نے ـــــ جیسے کوئی مخمور ہو یا عالمِ خواب میں ـــــ ہاتھ بڑھا کر گلاب لے لیا، وُہ چاہتا تھا کہ کُچھ کہے، شکریہ ادا کرے ـــــ لیکن اتنی ہی دیر میں منصبدار بہت آگے نکل چکا تھا!

سواریٔ بادبہاری گزر گئی۔ مجمع منتشر ہو رہا ہے۔ استیف گلاب کا سُرخ پھُول ہاتھ میں لئے جا رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاہی منصب دار خاص طور پر اُس کی طرف کیوں مائل ہوا۔ ہزار ہا آدمیوں کے مجمع میں گلاب کا پھُول تنہا اُسی کو کیوں دیا گیا ـــــ؟

گلاب بہت بڑا اور بہت خوبصورت تھا۔ وُہ اس قسم کا پھُول تھا جس کے چند ہی درخت شاہی باغیچے میں تھے اور شاہی باغیچہ کے علاوہ کہیں نہ تھے۔ یہ گلاب بائی زنطہ میں شاہی محل کے علاوہ کہیں میسر نہ آسکتا تھا۔ مجمع سے باہر نکل کر استیف نے بغور اُس پھُول کو دیکھا۔ اُس کی پتیوں کے نیچے ایک پرزہ بندھا ہوا تھا۔ اُس پرزہ پہ سُرخ رنگ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"شاہی محل کے جنوبی دروازے پر ـــــ آج دس بجے ـــــ یہ پھُول لیکر آؤ ـــــ اس پھُول سے تمہاری قسمت کا دروازہ کھلے گا!"

اسٹیفن ششدر تھا۔ وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس واقعہ کے معنی کیا ہیں وہ کیوں محل کے دروازے پر جائے۔ اُسکی قسمت کا دروازہ کیونکر کھل سکے گا۔ اُسکا دل کہتا تھا:-

"جانا چاہیئے، اگر یہ شاہی اکرام و الطاف کا اشارہ ہے تو تیری قسمت جاگ جائے گی۔ کیا معلوم تو شاہی دربار میں منصبدار بنا دیا جائے۔ کیا معلوم تُو کیا ہو جائے ——— جانا چاہیئے۔"

عقل کہتی تھی:-

"کوئی دھوکا، کوئی فریب تو نہیں، بھلا کہاں ملکۂ عالم، کہاں تو غریب دہقانی منصبدار نے تیرے گنوار پن کا مذاق نہ اُڑایا ہو یا کسی دشمن نے تجھے دھوکہ دیکر نہ بلایا ہو۔"

عقل اور دل کا جھگڑا ختم نہ ہوتا تھا۔ لیکن قدم دل کے فرمانبردار تھے عقل کا زور ان پر نہ چل سکا۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے اسٹیفن کے قدم بلا ارادہ شاہی محل کی طرف بڑھنے لگے۔ کبھی اپنے دل سے، کبھی اپنی عقل سے اُلجھتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا ———

دل کہتا:-

"تیرا انتظار کیا جا رہا ہے، قدم بڑھا۔"

عقل کہتی:-

"تو بیوقوف ہے، تیرا اور انتظار! دیوانے! سپاہیوں اور دربانوں کی ٹھوکریں کھائیگا"

جوانی کا خون گرم تھا۔ دل کی حرکت تیز تھی، چہرہ پر سُرخی جھلک رہی تھی، پیشانی پر پسینہ

کے قطرات تھے۔ اس طرح استیبق شاہی محل کے دروازہ پر پہنچا۔ اُس کو یہ خبر نہ تھی کہ دروازہ مغربی ہے یا مشرقی! وُہ بڑھا چلا گیا!

شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ بڑے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اسکے قدموں کی آواز اور تلواروں کی چمک استیبق کو اپنے ساتھ کھینچے ہوئے اندر لے گئی۔ وُہ محل کے پہلے برآمدہ میں داخل ہوا۔ جہاں شاہی دربان مسلح کھڑے تھے۔ ایک قوی الجثہ حبشی بارگاہ کے سراپردے کے پاس ایک برہنہ تیغہ ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا تھا۔ استیبق نے آگے بڑھکر سُرخ گلاب اُس کے سامنے پیش کیا۔۔۔۔۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہے کیا؟

دربان مسکرایا۔" بیوقوف آدمی! مجھے کوئی حسین چھوکری سمجھا ہے تو نے؟ گدھا!"

استیبق کے بدن میں ان تحقیر آمیز الفاظ نے آگ لگا دی۔ وُہ بے اختیار ہو گیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کس طرح اُس نے دربان کے سیاہ تاب گال پر ایک چانٹا مارا۔۔۔۔۔ سارے برآمدہ میں شور مچ گیا۔ محافظ دستہ کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کے قبضوں سے مار مار کر استیبق کو فرش پر گرا دیا۔ چند منٹ میں اُس کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ہنگامہ کی آواز سُن کر دربانوں کا داروغہ کمرہ سے نکل آیا۔ اُس کو دیکھکر سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

"ارے تو کون ہے دہقانی؟" داروغہ نے کہا

استیبق جھنجلایا ہوا اُٹھا۔ اُس کا گلاب زمین پر گر گیا تھا۔ اُسکی چند پتیاں منتشر ہو چکی تھیں جُھک کر اُس نے گلاب کو زمین سے اُٹھا لیا اور اُٹھا کر داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔

"ہاں! سُرخ گلاب کو دیکھ کر داروغہ مسکرایا۔" بیوقوف آدمی! اس پھول کو لے کر

یہاں کیوں آئے ؟"

پھر اُس نے مجمع کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو جھڑکا :-

"جاؤ اپنا کام کرو، کیا کچھ تماشہ بنایا ہے "۔ جب سپاہی ہٹ گئے تو اُس نے استیف کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر دبی زبان سے کہا :-

"یہ حماقت کی تم نے! اس پھول کو لے کر یہاں گھس پڑے - تمہیں جہاں یہ پھول لے کر جانا چاہیئے، یہ وُہ جگہ نہیں "۔

یہ کہکر استیف کو وُہ اپنے ساتھ ایک دوسرے دروازہ پر لے گیا اور وہاں کے چوبدار کو آواز دے کر کہا

"لو یہ ایک بیوقوف پھول والا آیا ہے۔ اس کو اندر پہنچاؤ - یہ آدمی ہماری طرف کا نہیں ہے - تمہاری طرف کا ہے "۔

ملکہ کے چوبدار نے پھول پر نظر کی اور استیف کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ملکہ کے محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

آراستہ اور خوبصورت برآمدوں اور کمروں سے گزر کر —— آگے آگے چوبدار اور اُس کے پیچھے استیف —— دونوں ایک پُر فضا باغیچہ میں داخل ہوئے، جس کے وسط میں ایک فوارہ جاری تھا، اُس کے پانی کی سطح پر سینکڑوں رنگین پھول تیر رہے تھے۔ باغیچہ سے گزر کر ملکۂ عالم کی خاص محلسرا تھی۔ محلسرا کے برآمدوں میں نوعمر اور خوبصورت لڑکے ، زرق برق لباس

پہنے ہوئے، حسین مامائیں اور باندیاں، خوفناک شکل کے خواجہ سرا اور حبشی غلام جن کے سروں پر زرد پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں، کچھ بیٹھے، کچھ لیٹے، کچھ ٹہل رہے تھے، کچھ چھوکریاں قدم بڑھائے اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔ استیفن کے دہقانی وضع اور پھر اُس کے ہاتھ میں سرخ گلاب کے پھول کو جس نے دیکھا، وہ منہ پھیر کر مسکرا دیا۔ شاہی خواصیں اپنے ہاتھ کے پنکھوں کی آڑ میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں اور کم عمر لڑکے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روک رہے تھے۔

استیفن کو اپنے گرد و پیش ان حرکات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ چوبدار کے پیچھے پیچھے پردہ اُٹھا کر شاہی محلسرا کے خاص کمروں میں داخل ہوا۔

ایک مزین کمرہ کے ایک گوشے میں ریشم کے قرمزی پردوں کی آڑ میں، بڑے بڑے گدوں اور تکیوں پر ملکہ تھوڈورا آرام فرما رہی تھیں۔ ایک رنگین فوارہ کمرے کے وسط میں جاری تھا چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کی مہک سے تمام کمرہ معطر تھا کچھ ایسی ہلکی روشنی، ریشمیں پردوں میں سے چھن چھن کر کمرہ میں آ رہی تھی جیسی کہ رات کے ختم ہونے اور دن کے شروع ہونے کے وقت ہوتی ہے ـــــ وہ سب جنت کا ایک تخیل تھا جس کو استیفن نے آج اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ـــ ریشم کے پردوں کی آڑ سے اس دھندلی روشنی میں، ملکہ نے اشارہ کیا، کمرہ کے سکونِ کامل میں، رومی قالینوں پر استیفن کے قدموں کی آواز گم تھی۔ وہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے ملکہ تھوڈورا کا آغوشِ محبت اپنے لئے کھلا ہوا پایا!

"تمہارے جانے کا وقت آگیا۔" نظریں نیچی کئے ہوئے ملکہ نے فرمایا۔

استیف کے جسم میں ایک عجیب لرزش، ایک عجیب سنسناہٹ تھی جو آج سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہ کی تھی!

وُہ ابھی تک ملکہ کے آغوش کی مستیوں سے مخمور تھا! ـــــ اُس کا دل دھڑک رہا تھا جب اُس نے کہا:۔

"کیا پھر کبھی ملاقات نصیب ہو گی؟"

ملکہ مسکرائی! استیف اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا کہ یکایک وہی خواجہ سرا جو اس کو اندر لایا تھا۔ کمرہ میں داخل ہوا۔ استیف چونکا۔ اُس کو محبت کی خلوت میں خواجہ سرا کی یہ دراندازی ناگوار گذری۔ گویا یہ سیاہ فام حبشی اس کی اس نئی محبت کے راز کو فاش کئے دیتا ہے! لیکن ملکہ سے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وُہ یک گونہ مایوس ہوا اور سر جھکائے دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔ ملکہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر وُہ پھر ذرا رُکا۔

"استیف کل پھر آؤ!"

ملکہ کے شیریں لبوں سے یہ شیریں پیام الفت کس قدر روح پرور اور دلنواز معلوم ہوا اُس دھندلی روشنی میں ملکہ ـــــ نہ جانے کس طرح ـــــ اس کمرے سے جا چکی تھی۔ استیف نے اس کو جاتے نہ دیکھا۔ لیکن اُس کی جگہ خالی تھی اور استیف "وعدۂ فردا" کی مسرتوں سے جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم باقی تھے کہ ایک حبشی غلام کی ٹوکر اچھوئی

اس کی پشت پر چمکی اور چشم زدن میں اس کی پشت کی طرف سے سینہ کے پار ہو گئی۔ وُہ صرف ایک ہچکی لیکر دروازے کے سامنے فرش پر اوندھا گر گیا۔

غلام نے چند لمحے اپنی چھری کو اُس کے گرم جسم میں آرام لینے دیا۔ اس کے بعد اس کے خون آلود پھل کو باہر کھینچ لیا۔ استیبف کے سر کے لمبے بالوں سے اس حبشی نے اپنی چھری کا خون صاف کیا۔ پھر لاش کی ٹانگ پکڑ کر اُس کو کھینچتا ہوا کمرہ کے باہر لے گیا

اُس کمرے کے فرش پر، جہاں استیبف نے ایک لمحہ کے لئے تھیوڈورا کے آغوش محبت کی ایک بازی لگائی تھی۔ سُرخ گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی رہ گئیں اور اُن پتیوں میں سے ایک پر استیبف کی جوانی کے گرم خون کا صرف ایک قطرہ جما ہُوا رہ گیا۔

اسی شام کو جب چند ملاح اپنی کشتیاں، ساحل کی طرف لا رہے تھے۔ شاہی محل کے چور دروازے سے باسفورس کے پانی میں ایک سربند تھیلا جو خون آلود بھی تھا، پھینکا گیا؛ ملاحوں نے دیکھا اور اپنے پتوار تیزی سے چلانے لگے۔ اُن کے لئے اس قسم کے تھیلے کوئی نئی چیز نہ تھے۔ ہر روز صبح و شام وُہ دیکھا کرتے تھے کہ شاہی محل سے باسفورس کی بھوکی مچھلیوں کی یہ مخصوص غذا پانی میں پھینکی جاتی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا، اور بائی زنطہ میں کس کو معلوم نہ تھا کہ رحمدل ملکۂ عالم "حسن کی دعوت" کے بعد باسفورس کی مچھلیوں کے لئے اپنے حُسن کے دستر خوان سے تازہ غذائیں پہنچایا کرتی ہیں!!

وہ میرا انتظار کر رہی ہے

زندگی کے پُرشور دریا میں، رات کے وقت، کتنے دیئے بہے چلے جاتے ہیں! حیاتِ انسانی کے کوہساروں میں کتنے جگنو چمکتے ہیں اور پھر ان کو ظلمتِ شب اپنی چادر میں لپیٹ کر نہ جانے کہاں لے جاتی ہے؟ آسمان پر کتنی بجلیاں چمکتی ہیں اور پھر کالے بادلوں میں مُنہ چھپا لیتی ہیں۔ بادل کی گود سے ہزار مرتبہ نکلتی ہیں اور پھر اسی میں جا کر چھپ جاتی ہیں۔

یہ آٹھ پہر کی داستان ہے۔ گوشِ ہوش سنتا ہے اور چشمِ عبرت دیکھتی ہے!! ظاہر کی تشریح بیکار اور عیاں کا بیان فضول، پھر کہیئے کیا کہ دل کے زخموں کا لطف کہہ دینے سے دونا ہوتا ہے۔ مسکین فاختہ اپنے زخم کو اپنے پروں سے چھپا لیتی ہے مگر

انسان زخم کو کریدتا رہتا ہے کہ کہیں خلش کم نہ ہو جائے۔ خون نہ رک جائے!

اس کے زخم کی جان بہتا ہوا گرم خون اور دُکھتا ہوا جسم ہے، گرم خون اگر نہ بہے تو تالاب کے پانی کی طرح میلا اور ناپاک ہوتا ہے جسم اگر دُکھے نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ خاک ہے۔ سفر حرکت کا نام ہے اور حضر موت ہے، زندگی زخم ہے اور موت اسکا اندمال!

بس میری آنکھوں سے دیکھو کہ میرا سفر خارِ مغیلاں کے بغیر بے لطف رہتا۔ اور میری منزل درد کی تڑپ اور زخموں کے بغیر سونی اور ویران!

چمن کی کیاریوں میں جب نسیمِ شمال آتی ہے تو اس کے جھونکے بند کلیوں کو کھلا دیتے ہیں۔ مگر جو پھول کھل چکے ہیں۔ اُن کی پتیوں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں!

میرے مرجھائے ہوئے پھولوں کی کیاریوں میں جب کبھی کوئی جھونکا آتا ہے تو وہ دو چار پتیاں اڑا کر لے جاتا ہے۔ پتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ مگر بے رنگ نہیں ہوتیں ان کا اجڑا ہوا رنگ بھی دورِ بہار کی ایک داستان بیان کرتا ہے۔

ہاں! ان خشک پتیوں کی داستان خشک نہیں ہے۔ آبشار کی ملکہ سے پوچھو۔ وہ میری داستان کی تصدیق کرے گی۔ میری داستان اُسی کی داستان ہے۔ کیا وہ بھول گئی ہو گی؟

ایک شعاعِ نور تھی کہ فضائے بسیط میں چمکی۔ اور اپنے ہی نور میں محو ہو گئی۔ زندگی کا ایک ہلکا نغمہ تھا۔ کہ ہوا کا ایک جھونکا اُس کو کہیں سے لایا۔ اور لے گیا!

ایک ننھی کلی تھی کہ پھول بنی اور بن کر مرجھا گئی۔ یا ستارۂ امید تھا کہ چند لمحوں کیلئے اپنی خنک روشنی سے دنیا کو منور کر کے رخصت ہو گیا . . . . . تھا کیا ؟ مجھ سے نہ پوچھو! میں جانتا ہوں مگر بتاؤں گا نہیں! ہاں نہیں بتاؤں گا! اور کیونکر بتاؤں کہ بتا سکتا نہیں اگر کوئی شخص آنکھ کے نور اور روح کی گہرائی کو چھو سکتا ہو۔ تو صرف وہی۔ اس شارحِ نور اس نغمۂ حیات اس ستارۂ امید کی حقیقت سے بھی آشنا ہونے کا دعویٰ کرے!

میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور زندگی میں میرا وہ شاید پہلا اور آخری خواب تھا۔

میں نے دیکھا کہ آسمان پر ستارے رقص کر رہے ہیں۔ ماہتاب کی شعاعیں کانپ رہی ہیں چادر ماہتاب کبھی ایسی خنک اور جاں بخش نہ تھی جیسی کہ اُس شب کو۔ ماہتاب کی ایک کرن پر جو آسمان سے زمین کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اِس طرح جیسے دو تارہ کے تار پر موسیقی میں نے اس کو کھیلتے ہوئے پایا! زمین سے آسمان تک ایک عالمِ لاہوتی تھا۔ اور اس فضا میں زندگی کا ایک چشمہ اُبل رہا تھا۔ اُس چشمے کے آبشار ہنستے ہوئے پھولوں اور مسکراتی ہوئی کلیوں کے انبوہ میں اس طرح گر رہے تھے گویا بنا بانہ لوٹ رہے ہیں۔ نور کی ان موجوں میں بہت سی سُرخ اور سبز مچھلیاں تیر رہی تھیں کھیل رہی تھیں۔ رقص کر رہی تھیں۔ مگر ایک زمردین مچھلی ان سب کے درمیان تھی۔ جو نہ کھیلتی تھی نہ رقص کرتی تھی۔ اسکے سر پر ایک دُر شاہوار تھا کہ اس کا مثل میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آبشار کی روانی کے ساتھ یہ ماہیِ زمردین ایک عالمِ استغراق میں کچھ کھوئی ہوئی بھولی ہوئی پھولوں اور کلیوں میں اُلجھ اُلجھ کر پیچھے ہٹتی اور پھر آگے بڑھتی تھی۔ آگے نکل کر پھر پیچھے ہٹتی تھی۔ پھر آگے جاتی تھی۔ ہر شاخِ گل سے اُلجھتی تھی۔ ہر پھول

کو مس کرتی تھی۔ اور گویا مایوس ہو کر کبھی آگے بڑھ جاتی تھی۔ کبھی پیچھے ہٹ آتی تھی۔ وہ اس عالمِ رنگ و بو میں سب سے علیحدہ اور سب کے ساتھ تھی!

میری نظروں میں طاقت نہ تھی کہ اس کا راستہ روکیں —— میں نے ہاتھ بڑھایا! انسان کا خود غرض ہاتھ! جو پھولوں اور کلیوں کو صرف اِس لئے مسلتا ہے کہ انکا مسلنا اُس کی حیوانیت کے لئے تسکین بخش ہے۔ رنگ و بو کو رنگ و بو کی خاطر وہ پسند نہیں کرتا اُس کو تو محض اپنے نفس کی "طلب" آگے بڑھا کر پھولوں کے توڑنے اور سبزہ کے مسلنے پر آمادہ کرتی ہے!

میرا خود غرض ہاتھ پانچ انگلیوں کا جال لیکر بڑھا۔

پھولوں کے جھمگٹے میں ابھی اس ماہئ زمردین نے شاید دو چار ہی چکر لگائے تھے کہ میرا ہاتھ اس کی کمر تک پہنچا۔ اور شاید نہ پہنچ سکتا۔ اگر میں خود تا بہ کمر پانی میں نہ پہنچ گیا ہوتا۔!

پھول میرے جسم کو مس کر رہے تھے، کلیاں مجھے گدگدا رہی تھیں۔ پر میں دیوانہ وار اس سبز پوش پر دستِ ہوس دراز کر رہا تھا۔ یہ تو میں نہ کہوں گا کہ قصور تنہا میرا ہی تھا اس لئے کہ اگر میں نے ہاتھ بڑھایا تھا تو کچھ کشش اس کی طرف سے بھی تھی۔ اُس کے زمرّدیں لباس اور اس کے حسنِ تمام نے بھی میرے دستِ طلب کے ساتھ سازش کی تھی! اور شاید آبشار کے اُن شریر پھولوں نے بھی مجھے اشتعال دلایا تھا۔ بہر حال میرا گناہ آلودہ ہاتھ جو خدا جانے کتنے پھول مسل چکا تھا۔ پانی کی اس ملکہ تک پہنچا۔ اور میں

نے سمجھا کہ پانی کی اب تمام شہنشاہی میرے ہی لئے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن شاید دستِ طلب کی صرف ایک انگلی سے میں نے اس جسدِ زمردیں کو چھوا ہو گا۔ کہ ایک بجلی میری آنکھوں کے سامنے چمکی۔ اور جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ آبشارِ زندگی کی وہ کجکلاہ ایک شعاعِ نور بنکر سطحِ آب سے نکلی، بہ یک آن واحد چمک کر اُٹھی۔ اور میری آنکھوں کے سامنے سے گزر کر ماہتاب کے ہالہ میں جا بیٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ آج تک میں اُس کو اپنے تختِ آسمانی پر متمکن دیکھتا ہوں اور پچھتاتا ہوں کہ میں نے اس کو چھوا کیوں تھا!

صبح کو جب کہ ہنوز دامنِ مشرق چاک نہیں ہوا تھا میں اُس آسمان کی ملکہ کو خاموش آسمان پر صبحِ کاذب کی روشنی میں جھلملاتے دیکھتا ہوں۔ شب کو بھی میری نظر اُسی ستارۂ امید پر جمی ہوتی ہے۔ جس کی خنک شعاعیں اپنا پیام لے کر رات بھر میرے پاس آتی رہتی ہیں۔ اور میرے پیام لیکر آبشار کی اسی زمردیں ملکہ تک واپس جاتی ہیں۔ جو اپنے آسمانی مسکن میں نور کا لباس پہنے بیٹھی ہے!

میں جانتا ہوں کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے! پس جس دن میرا یہ جسدِ خاکی سپردِ خاک ہو گا۔ اس دن تم اس ستارے کے چاروں طرف ایک ہالہ دیکھو گے۔ وہ ہالہ میری روح ہو گی!!

۱۹۱۸ء

میں!

وہ جو فلسفہ زندگی کا سمندر ایک کوزہ میں بند کر دیتا تھا۔ ترجمانِ فطرت، غالب اپنے ایک مصرعہ میں زندگی کی ساری داستان یوں کہہ جاتا تھا کہ اب سر دُھنا کیجیے!

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو!

اس خلوت میں کتنی انجمنیں سجائی جاتی ہیں۔ اور ان انجمنوں میں کیسے حشر بپا ہوتے ہیں اُدور کیوں جائیے۔ اپنی یا میری ہی خلوت کی انجمنوں کو دیکھ لیجیے۔ میں آج اپنی انجمن کو دوسروں کی نظر سے دیکھ رہا ہوں!

ایک زمانہ تھا اور وُہ زمانہ کیفِ حیات اور نشاطِ زندگی کا زمانہ تھا، جب خاک کا ہر ذرّہ زرّیں، ہر قطرۂ خون لعلِ بدخشانی، ہر زخم ایک تبسّم، ہر آواز نغمہ اور پانی کا ہر قطرہ شرابِ ناب تھا! جب دل کی مستانہ کیفیتیں عقل کی رہنمائیوں پر ہنستی تھیں اور ہر برگِ خزاں رسیدہ ایک صحنِ چمن نظر آتا تھا۔ یہ وُہ دن تھے کہ خلوت خانۂ خیال میں عجب عجب محفلیں جما کرتی تھیں۔

اب اُن تصویروں کا رنگ دُھندلا نظر آتا ہے! اب بھی ان تصویروں کو ایک نظر دیکھ لیجئے:

دولت کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ!

زرکار مسندیں مخملی گدّے، دیبا و اطلس کے پردے اِس قدر معمولی چیزیں کہ میں اپنے گرد و پیش نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مشرق میں عالیشان دیوانخانے، مغرب میں سربفلک کوٹھیاں، سب گھر کی سی باتیں ہیں! مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق جدھر جاتا ہوں، خاک کے ہر ذرّے کو طلائے خالص پاتا ہوں، مشرق کے دیوان خانے میں ایک مرصع پیچوان میرے سامنے ہے۔ اور مغرب کے قصرِ دولت و اقبال میں بہترین رکابدار میرے دسترخوان کے سامنے دست بستہ حاضر ہیں۔ جب چاہتا ہوں مشرق کی زرکار قبا اور مرصع سرپیچ کو مغرب کی عشوہ فروشیوں پر نثار کر دیتا ہوں اور جب چاہتا ہوں، مغرب کے خزانوں کو مشرق کے صنم کدہ پر قربان!

یا پھر ایک دن دیکھتا ہوں کہ مجھے "مغرب" نے اپنے آغوشِ محبت میں کچھ اس طرح لے لیا ہے کہ میں اب زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتا۔ مشرق و مغرب کا فساد ظلمت و ضیا اور تہذیب و جہالت کے سارے مناقشے ایک اونچی ایڑی پر قربان کئے جاسکتے ہیں۔ وطن (کیا وہ مشرق میں ہے ؟) اس قربانگاہ پر ایک ادنیٰ نذرِ عقیدت ہے جس کو سب سے پہلے پیش کر دینا چاہئے۔ اِس مغربی دیس کی "روشنی" کے بغیر زندگی ایک اشکِ شبنم، ایک آوازِ ماتم۔ ایک زخمِ اجل سے زیادہ نہیں!

یا پھر کسی دن میرے خلوت خانۂ خیال میں ایک خوفناک فرشتہ آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تیری جگہ یہ نہیں ہے۔ چل! کہ تجھے سیر آدھ سیر چاندی کے بدلے میں غلام بن جانا چاہیئے۔ دماغ، دل، ضمیر، ناطقہ، غیرت، حمیّت، حتّٰے کہ اپنی روح معہ اُس کی تمام لاہوتی طاقتوں کے مجھے اِس چاندی کے لئے فروخت کرنی ہوں گی۔ غرورِ اِنسانی کو جو تیرا بہترین خلعت ہے، اِسی طرح اتار دینا ہوگا۔ جس طرح تیرے دادا نے جنّت میں گیہوں کے چند دانوں پر اُس کو قربان کر دیا تھا —— یہ سنت تجھے بھی ادا کرنی ہوگی!

فرشتہ مجھے کہاں سے کہاں لے آیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک دن کے رات کے ۲۴ گھنٹے مصیبت، مشقت اور ذلّت کی بوجھل گاڑی، زندگی کے اِس ویران راستے پر اپنا سفر پورا کرتی ہے۔ مگر ہر شام کو میں اپنی گاڑی اسی جگہ پاتا

ہوں۔ جہاں سے صبح روانہ ہوئی تھی!

مجھے یہ سفر مہلت نہیں دیتا کہ میں زندہ ہونے کا دعوےٰ کرسکوں یا جو مجھ کو مردہ کہتے ہیں۔ ان کو اپنے اندر ایک ذرا سا نشانِ حیات دکھا کر جھٹلا سکوں!

کتابِ خلوت کے ورق کتنی جلدی اُلٹ جاتے ہیں۔ اور اس داستانِ خیال کا ہر باب کس قدر مختصر ہے! آج میں اپنے کو لاکھوں نفوس کا قائدِ اول دیکھتا ہوں۔ گو کہ لچھمی کی نگاہِ کرم کا ہنوز منتظر ہوں۔ تاہم شہرت نے اپنا تاج میرے سر پر رکھ دیا ہے اپنے کو خلقِ خدا کی عافیت کا ضامن پاتا ہوں۔ اور ان ذمہ داریوں کو، جو خلقِ خدا کے متعلق میں نے اپنے اوپر عائد کر لی ہیں پھولوں کے ہار کی طرح گلے میں ڈالے پھرتا ہوں۔ تا کہ جدھر جاؤں۔ لوگ ان پھولوں کی مہک سے مست ہو کر پکار اٹھیں :-

"ہمارا لیڈر آیا!"

دلوں کی تسخیر دیوتاؤں کا ایک مخصوص فن ہے جس کو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ میرے طنبورہ کا ہر تار دلکش نغموں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ان نغموں میں میری انگلیاں ہر موقعہ کے مناسب ایک ناقابلِ فتح جاذبیت پیدا کر دیتی ہیں!

صحنِ مسجد میں مسجد کا علم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مدرسہ میں کون ہے۔ جو مجھے "ماہر" تعلیم نہ کہے؟ سیاست کی الجھنوں کو کس کا ناخنِ تدبیر سلجھاتا ہے؟

"بزرگانِ ملت" کی صفِ اولیٰ میں گویا ہر نظر مجھ پر ہی پڑتی ہے! . . . مسجد

مدرسہ یا بازار کچھ ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس سر پر شہرت کا تاج رکھا ہو۔ اُس کو نیچا نہ ہونا چاہیئے اور اس حالت میں کہ ہاروں اور بدہیون کا بوجھ گردن کو جھکائے یا اُس حالت میں کہ میری معصوم اور بے خبر "بھیڑیں" میری گاڑی کھینچ رہی ہوں۔ اس حالت میں (میرے پیشہ کے اساتذہ کہہ گئے ہیں کہ) اخلاق اور انکسار اچھا اور زود اثر نسخہ ہے! انسان کا لباس ہر موقعہ کے مناسب ہونا چاہیئے۔ وُہ ادائے بے نیازی جو ہم ہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے اور صرف ہمارے ہی قبیلہ کا نشانِ امتیاز ہے۔ ایک سپر ہے جو ہمارے چہروں کو ادنے درجہ کی مخلوق کی ناپاک نظروں سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور نہ جارحانہ کاروائی کے لئے تو انکسار ہی بہترین حربہ سمجھا گیا ہے۔

یہ تصویر بھی نامکمل ہے۔ میری ہر تصویر نامکمل ہوا کرتی ہے۔ میرے خلوت خانہ کا ہر مرقع اُدھورا اور ہر آئینہ دھندلا ہوتا ہے۔ یہی میری زندگی کا طور ہے!!

ایک دن میں نے دیکھا کہ سورج کی روشنی نہایت ٹھنڈی اور موسم گرما کی ہوائیں بہت خنک ہیں۔ تمام کائنات پر ایک سکونِ مطلق طاری ہے اور . . . . میں ایک میز کے سامنے تنہا بیٹھا ہوں۔ کاغذوں اور کتابوں کا انبار میرے سامنے ہے اور میرا تمام وجود روحانی اساتذۂ سلف کے ان دماغوں پر لوٹ رہا ہے جو

میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں! عظمت گذشتہ کی یادگاریں، سطوتِ دیرینہ کے افسانے شاہراہِ حیات کے بہت سے نشانِ راہ، شہرت کے مینار، دولت کے شکستہ در و دیوار درد کے افسانے، دل کی کہانیاں، غرضیکہ میری میز پر ایک محشرِ خیال برپا ہے اور میں؟ . . . . . نہ اتنا بلند ہوں کہ خدا کی مخلوق مجھے مور و ملخ سے کمتر نظر آئے نہ اتنا پست ہوں کہ خلقت کے گردابِ معصیت میں پھنس جاؤں۔ اس تنکے کی طرح جو دریا کے بہاؤ سے جدا ہوتا ہے۔ میرا سکونِ مطلق مجھ کو بہاؤ سے الگ کئے کھڑا ہے۔ گزرنے والوں کے پیام مجھ تک آتے ہیں میرے پیام ان تک جاتے ہیں مگر میرے قریب کوئی نہیں آتا اور میں کسی کے قریب نہیں جاتا۔ ایک فقیر جس پر مکھیاں بھنک رہی ہوں اور ایک امیر کہ اس پر سمندر کے موتی اور خشکی کے ہیرے نچھاور ہو رہے ہوں میرے لئے یکساں ہیں۔ میرا استغنا دونوں سے دور ہے!

انیسؔ و مومنؔ و ذوقؔ و غالبؔ کی روحیں مجھ سے ملنے آ رہی ہیں۔ حافظؔ و سعدیؔ اور خسروؔ کے پیغامِ محبت مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔ میکالےؔ اور شیلےؔ اور بائرنؔ کی دعائیں میرا دامن پکڑے ہوتی ہیں۔ دنیا میرے لئے شہرت کا تاجِ زریں بنا بنا کر لاتی ہے۔ اور میں اس کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں!

"غلامانِ وقت میرے لئے امتیازی تمغے تجویز کرتے ہیں۔ اور میں ان کو کھڑا دیکھتا ہوں ——— گویا مکھیاں ہیں کہ میرے کمرے میں گھس آئی ہیں ———
کتاب کے ہر ورق میں میری روح سما جاتی ہے اور میرے چھوٹے سے حجرے میں

میری ساری دُنیا آباد ہے!

صبح کو یہ حجرہ بھی خالی ہو جاتا ہے! اور اس وقت جبکہ صبح کے "دروازہ خاور" سے غالب کا "نگارِ آتشیں رُخ" اپنی ترچھی شعاعوں کا جال پھیلا کر سارے برفستان ہمالہ کو اپنے سنہرے آغوش میں لینا چاہتا ہو - اور اُس بلندی سے عروسِ دہر کے حُسنِ مشاطہ طلب کے لئے افشاں کی پڑیاں باندھ باندھ کر پھینک رہا ہو - اُس وقت جبکہ صنوبر کی مست ہو کر جھومنے والی ڈالیوں کے راگ ہمالہ کی وادی ایمن پر محیط ہو رہے ہوں - جب شبنم کے قطروں میں رنگین روشنی کی ریزش جاری ہو ——— اور اس وقت جبکہ اُفق پر رات کے بھاگے ہوئے سیاہ تاب بادلوں کی زنگاری اور طلائی جھالر ہمالہ کی پیشانی کا جھومر بن رہی ہو ——— اس وقت ایک خاموش آواز، ایک روشن تاریکی، ایک مشاہدہ فطرت جو آنکھ کا منت کش نہیں - ایک آواز جو مُنہ سے نہیں نکلتی مگر کانوں تک پہنچتی ہے - ایک گرفت جو بغیر ہاتھ کے بھی ممکن ہے مجھ کو آغوشِ فطرت سے اُٹھا اُٹھا کر ایک ناپیدا کنار قلزمِ محبت میں غوطے دیتی ہے اور اس صبح کو جس طرح سمندر کا روشنی والا مینار موجوں کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتا ہے ——— اسی طرح ——— میں عالمِ حیات کی جاذبیت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوں . . . . دُنیا کو خبر نہیں ہوتی ——— اور خبر ہوتی بھی تو وہ کیا کرتی؟ ——— کہ میں اس سے بہت دُور ہوں!!!

میرے کان میں کوئی کہتا ہے ـــــ ہمالہ کی چوٹی پر کب تک بیٹھے رہو گے؟
ویرانوں اور ریگستانوں میں بھی جانا ہے۔ سورج کی شعاعیں کبھی ٹھنڈی بھی ہو جائیں تو
ہمیشہ ٹھنڈی نہیں رہا کرتیں! ابھی سفر کی منزلیں باقی ہیں!!

(۱۹۱۸ء)

قمیص

اُس کی رعایا اُس سے خوش تھی۔ اُس کے اُمرا، اُس سے رضامند تھے، اُس کے اہل و عیال اُس کا دم بھرتے تھے ——— وُہ نہایت نیک انسان اور نہایت رعایا پرور بادشاہ تھا۔ اُس نے مزاجِ شگفتہ، طبیعت نیک اور دل صاف پایا تھا۔

مگر وُہ چند روز سے بیمار تھا۔ مرض کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اطباء کی کوششیں ضائع ہو رہی تھیں۔ رعایا پریشان، شاہی محل میں ہر شخص متردّد اور ارکینِ سلطنت سرگرداں تھے ——— کیا علاج ہو کہ جہاں پناہ کی طبیعت سنبھلے؟ دن، ہفتے، مہینے گزرے چلے جاتے تھے اور مریض کی حالت ہر صبح کو شام کے مقابلہ میں بدتر ہوتی جاتی تھی۔

مرض بھی عجیب تھا، نہ بخار تھا نہ درد تھا، نہ دُکھن تھی، نہ ورم تھا مگر جسم کا خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ نبض کمزور ہوتی جاتی تھی۔ مریض کا مزاج پژمردہ، طبیعت سرد اور قلب کمزور ہوتا جاتا تھا۔ نہ ہونٹوں پر تبسم تھا نہ باتوں میں چاشنی، احباب کی صحبت بھاتی نہ تھی۔ اہل و عیال کی محبت دل کے کنول کو کھلا نہ سکتی تھی۔ ذوقِ نفرت سے، اور لطف بے لطفی سے بدل گیا تھا۔ یوں کوئی فکر نہ تھی۔ کوئی وجہ نہ تھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ کوئی جھگڑا نہ تھا۔ زندگی ویسی ہی پُر سکون تھی جیسی ہمیشہ رہی، مگر پھر بھی زندگی بے کیف تھی! دسترخوان لذیذ اغذیہ سے بھرا ہوتا تھا مگر وُہ دو نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ موسیقی کے بہترین ماہر حاضر ہوتے تھے اور اپنا ساز چھیڑنے سے پہلے ہی سامنے سے ہٹا دئے جاتے تھے۔ دربارِ شاہی کی حسین رقاصہ ہر شام کو مُجرا عرض کرتی تھی اور اشارہ ہوتا تھا کہ ہٹ جاؤ، چلی جاؤ —— غرضیکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ جہاں پناہ بیمار کیا ہیں یہ سب کو معلوم تھا کہ بیمار ہیں!

مرض کی تشخیص نہ ہو تو علاج کیونکر کیا جائے؟ شاہی اطبّاء اور امراض کے بڑے بڑے ماہرین آتے تھے۔ گھنٹوں معائنہ کرتے تھے۔ نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے تھے۔ دل کی حرکت کو شمار کرتے تھے۔ خون کا امتحان کرتے تھے۔ دوائیں دیتے، غذائیں بدلتے سب کچھ کرتے جو کرنا چاہیئے۔ لیکن مرض کی نوعیت کا پتہ نہ چلا سکتے۔ صبح سے شام تک اراکینِ دولت، وزراء امرا محل کے خاموش کمروں میں، دالانوں اور شہ نشینوں میں بیٹھے ہوئے سرگوشیاں اور مشورے کرتے رہتے تھے لیکن فہم قاصر اور عقل حیران تھی۔

اس زمانہ میں ہمسایہ سلطنت کا ایک طبیب دُنیا میں بہت مشہور ہو رہا تھا۔ وُہ اس قدر طبیب نہ تھا جس قدر کہ حکیم تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وُہ نہ دوا دیتا ہے نہ نُسخہ لکھتا ہے مگر جو علاج کرتا ہے۔ کامیاب ہوتا ہے۔ ذرا سے چٹکلوں اور معمولی ترکیبوں سے وُہ مریض کے مزاج پر حاوی ہوتا ہے اور نہ جانے کیونکر مرض اُس کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ دُنیا میں اس کے کمالات کا چرچا تھا اور بالآخر جہاں پناہ کے امرا نے اس کی طرف رجوع کرنیکا فیصلہ کیا۔ عمالِ حکومت تیز رفتار سواریوں پر بھیجے گئے اور ملکوں ملکوں اس حکیم کو تلاش کر کے آخر لے آئے

مریض کی حالت اب بد سے بدتر ہو چکی تھی نشست و برخاست کی طاقت باقی نہ تھی زندگی کے دریا کا پانی خشک ہو چلا تھا جو باقی تھا۔ وُہ بھی روز بروز خشک ہوتا جاتا تھا۔

حکیم صاحب آئے نبض دیکھی۔ حالات سُنے۔ کوئی نسخہ نہیں لکھا اور اپنے معمول کے مطابق کئی دن تک نیم اعتکاف کی حالت میں غور کرتے رہے۔ آخر ایک دن اُنہوں نے تمام اراکینِ خاندانِ شاہی، امرا، و وزراء کو جمع کر کے اپنا فیصلہ سُنا دیا:-

"بادشاہ کی بیماری لا دوا ہے"۔

شاہزادوں اور شاہزادیوں کے چہرے زرد پڑ گئے، امراء و وزراء کو پسینہ آ گیا۔

"لا دوا ہے مگر . . . ."

حاضرین کے چہروں پر خون کی سُرخی جھلکی۔ حکیم صاحب کے ساتھ سب بول اُٹھے:-

"مگر . . . . ."

"مگر"۔ حکیم صاحب نے فرمایا "علاج ہو سکتا ہے"
سُننے والوں میں سے بعض کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ بعض نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ حکیم صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی :۔

"علاج ہو سکتا ہے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ پینے، کھانے اور لگانے کی دوائیں بیکار ہیں"
پھر اہلِ شوریٰ کے چہروں کا رنگ بدلا۔ ان میں کسی نے گھبرا کر کہا :۔
"تو پھر حکیم صاحب، پھر کیا کیا جائے"
"کچھ نہیں" حکیم صاحب نے فرمایا
"کچھ نہیں؟ کچھ بھی نہیں؟ کیوں حکیم صاحب کچھ بھی نہیں" سب نے گھبرا کر کہا
حکیم صاحب نے اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا دھاگا جوڑا :۔
"سُنئے سُنئے جو دوا بتاتا ہوں۔ اس کو تلاش کیجئے۔ جہاں پناہ کے خون میں وہ ذرات فنا ہو گئے ہیں جنکی گردش اور حرکت اطمینانِ قلب اور حقیقی مسرت پیدا کرتی ہے۔ اطبا کی دوائیں ان ذرات کو پیدا نہیں کر سکتیں طب معذور ہے۔ نہ وہ ذرات ایسی چیز ہیں کہ کسی معدن میں، کسی پہاڑ پر، کسی جنگل میں کسی جانور یا انسان کے خون میں تلاش کئے جا سکیں۔ یہ ذرات رُوح سے بھی زیادہ غیر محسوس ہیں"
"پھر وہ کہاں ملیں گے؟" کسی نے گھبرا کر سوال کیا۔
حکیم صاحب نے اس جملۂ معترضہ پر توجہ نہ کر کے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھا
"ایک ایسا انسان ڈھونڈئیے جس کو جسم وجان اور دل ودماغ کا اطمینان بہمہ وجوہ حاصل ہو ۔۔۔ بہمہ وجوہ ۔۔۔ سمجھے آپ؟ اُس کی میلی قمیص جو اس کے بدن پر ہو

مانگ لائیے یا اتار لائیے۔ جس طرح مل سکے لائیے اور جہاں پناہ کو پہنا دیجئے ——— اس شخص کے جسم کے ذرات صرف اسی طرح بادشاہ کے جسم میں منتقل کئے جا سکتے ہیں اور صرف یہی ایک علاج ہے۔" حکیم صاحب یہ کہکر اُٹھ گئے اور وُہ خاموشی جو سُننے والوں پر طاری تھی، دفعتہً بلند آوازوں میں بدل گئی۔ بیک وقت سب کے سب بولنے لگے:۔

"یہ کیا علاج ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا؟"

"کہاں ملے گی، کون لائے گا۔ کوئی ایسا آدمی بھی کہیں ملے گا؟"

"ہمارے بادشاہ کی سلطنت ایسے خوش نصیبوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ تلاش کی جائے۔ آدمی بھی ملے گا۔ قمیض بھی ملے گی۔ کیوں نہ ملے گی؟"

"فوراً، فوراً، کچھ مشکل نہیں۔ جانا چاہیے، ڈھونڈھنا چاہیئے۔"

چنانچہ مصاحبین میں سے دو اس کام کے لئے منتخب ہوئے کہ وُہ جائیں اور ایک ایسی قمیص ڈھونڈھ کر لائیں۔

دونوں روانہ ہوتے ہیں

"کیوں بھئی ایسا آدمی کون ہوگا ——— بھلا وزیر اعظم سے زیادہ کوئی خوش نصیب ہو سکتا ہے؟ دیکھا نہیں، وُہ ہر وقت کس قدر بشاش رہتے ہیں۔" ایک نے کہا۔

"سچ کہتے ہو۔" دوسرا بولا۔ "ہم نے تو کبھی اُن کو آزردہ خاطر دیکھا نہیں۔"

"تو پھر چلو انہیں کو پہلے جا پکڑیں۔"

جہاں پناہ کے دونوں مصاحبین وزیر اعظم کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم ابھی شاہی محل سے تشریف لاتے ہیں۔ ولیعہد سلطنت ان کو بہت عزیز رکھتا ہے اور چونکہ بظاہر بادشاہ مرض موت میں گرفتار ہیں۔ ولی عہد کی امیدوں کا ستارہ بہت روشن ہے اور وزیر اعظم انعام واکرام اور اپنے مراتب کی ترقی کا خیال کر کے بہت خوش ہیں۔ شاہی مصاحبین پر وہ ایک غلط انداز نظر ڈالتے ہوئے اپنی حرم سرا میں تشریف لیگئے۔ ابھی حرم سرا میں گئے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ اندر سے شہنائیوں اور خوش آواز باجوں کی آواز آنے لگی معلوم ہوا کہ وزیر اعظم خاصہ تناول فرما رہے ہیں۔ خاصہ کے بعد کچھ دیر آرام فرمائیں گے۔ اس کے بعد اگر حرم سرا میں تفریح کا کوئی شغل شروع نہ ہو گیا تو دیوان خانے میں تشریف لائیں گے۔

ایک گھنٹہ گذرا، دو گذرے مصاحبین ہنوز منتظر ہیں کہ دفعتہً محل کے اندر چیخ و پکار اور شور و شغب شروع ہو گیا۔ باہر کے خدام ڈیوڑھی کیطرف بھاگے اور اندر کی مامائیں چیختی چلاتی دروازے پر آئیں۔

"کیا ہوا، کیا ہوا، خیر تو ہے؟"

"بیگم صاحبہ ایک خواص کو چابک سے مار رہی ہیں۔ خواص ستون سے باندھ دی گئی ہے۔ اس کی کمر پر ہزاروں کوڑے پڑ رہے ہیں۔ سرکار نے اپنے کمرے کے کواڑ بند

کر لیتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کا غصہ، الاماں والحفیظ! وُہ تو اس وقت آپے سے باہر ہیں۔"

"تو آخر ہوا کیا؟ خواص کا قصور؟ کچھ تو ہوگا۔"

"قصور؟ اجی بس قصور نہ پوچھو؟ ہوا یہ کہ وزیر صاحب کھانے کے بعد آرام فرما رہے تھے نہ جانے کیسے یہ قطامہ ان کے کمرے میں پہنچ گئی رپھر گیا تھا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ بیگم صاحبہ نے سرکار کی ڈاڑھی کھسوٹ لی اور اب خواص کی مرمت ہو رہی ہے۔ سرکار نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ بیگم صاحبہ گرج رہی ہیں۔ خواص لہولہان ہے۔ تم پوچھتے ہو ہوا کیا؟ اس محل میں تو دسویں بیسویں کوئی نہ کوئی ٹنٹا ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"اجی بس رہنے دیجئے، سرکار کی سرکاری معلوم ہے۔ مالک کیا خاک ہیں۔ ان ہی حرکتوں پر کئی دفعہ بیگم صاحبہ کے ہاتھ سے پٹ چکے ہیں۔ وزارت اور وزیری حرم سرا کے باہر ہی ہے اور اندر تو بس بیگم صاحبہ کا جوتا ہے اور سرکار کا سر!"

"لاحول ولاقوۃ" مصاحبوں نے دبی زبان سے کہا اور آہستہ سے محل کے پائیں باغ کا دروازہ کھول کر نکل گئے۔

"چلو بھئی! ملک التجار کے یہاں چلیں۔ اُس سے زیادہ خوش نصیب اُس ملک میں کوئی نہیں۔ . . . دولت اس کی غلام ہے۔ بادشاہ کا وُہ خاص دوست ہے مٹی کو وُہ سونا بنا دیتا ہے۔ اہل و عیال کی پابندیوں سے بھی آزاد ہے۔ سنتے ہیں کہ دن رات بہت پُر کیف زندگی بسر کرتا ہے ـــــ آؤ ذرا اس کو جانچیں!"

ملک التجار ابھی ابھی ہواخوری سے واپس آئے ہیں۔ اُن کی سواری کے عربی گھوڑے دروازے پر کھڑے ہوئے دُمیں ہلا رہے ہیں اور ٹاپیں مار رہے ہیں۔ چوبدار اور خدام طلاکار لباسوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ ملک التجار کا محل خالص مرمر کا ایک عالیشان قلعہ ہے۔ جوانی میں خوب عیاشیاں کر چکے ہیں ـــــ اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی مے نوشی کر لیتے ہیں اور بس۔ اب تو دولت ہے اور وُہ ہیں۔ دُنیا کی کوئی فکر نہیں۔"

"آغا صاحب! ذرا ہماری اطلاع کرا دیجئے!"

"اجی رہنے بھی دو، اس وقت ملاقات کر کے کیا لو گے۔ سیٹھ صبح سے بہت پریشان ہیں رات ان کا بھانجا ایک قیمتی ہیرا چُرا کر چل دیا۔ صبح سے سیٹھ اسی کی تلاش میں سرگرداں تھے ہواخوری؟ ہواخوری کیسی؟ بدحواس ہو رہے ہیں۔ دُنیا بھر میں اس کمبخت کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دو چار دن میں رو دھو کر بیٹھ رہیں گے۔ ہاں یہ تو سچ ہے۔ ان کے جواہر خانہ کا کیا کہنا۔ ہزاروں ہیرے پڑے دمک رہے ہیں۔ ایک ہیرا نہ سہی نہ سہی۔ مگر ان کو سمجھائے کون؟ ایک ذرا سا ہیرا کیا گیا۔ گویا جان نکل گئی۔ بھل بھل رو رہے ہیں۔ عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہیں۔ چہار پہر گذر گئے۔ ایک کھیل بھی مُنہ میں اُڑ کر نہیں گئی۔ یہ حال ہے جیسے کسی کا بیٹا مر گیا ہو۔"

"لیجئے معلوم نشد بافندگی!" جہاں پناہ کے مصاحبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا!

نہیں بھائی دُنیاداروں کو چھوڑو۔ ادھر تو عیش کا کوئی دامن نہ ملے گا، جس پر غم کے دھبے نہ ہوں! دولت کا سگا بھائی غم ہے۔ یہ چیز جو ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔ ملے گی تو دینداروں ہی میں ملے گی۔ چلو مفتی صاحب کی طرف چلو۔"

مفتی صاحب بادشاہ کی سلطنت کے سب سے بڑے مفتی ہیں۔ علوم و فنون کی دولت وُہ مکہ اور ازہر سے لے کر آئے تھے۔ زہد و اتقا۔ ان کو وراثتاً اپنے باپ دادا سے ملا تھا۔ شریعت اور سنت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ مفتی بھی تھے اور شاہی مسجد کے پیش امام بھی۔ سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ میں بیعت بھی لیتے تھے۔ ملک کی آدھی آبادی ان کی مُریدی تھی۔ ہزارہا عقیدت مند ان کی صحبتوں میں حاضر ہو کر فیض حاصل کرتے تھے اور عرفان کے خزانوں سے دامنِ مُراد بھر کر لے جاتے تھے۔ دُور دور اُن کی پاک نفسی کا شہرہ تھا۔

اس وقت وُہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر صحنِ مسجد میں تشریف رکھتے ہیں مریدین کا حلقہ قائم ہے، جیسے شمع کے چاروں طرف پروانے۔ مفتی صاحب ابھی وظیفہ سے فارغ نہیں ہوتے تھے۔ بادشاہ کے مصاحبین کو آتے دیکھکر مریدین نے زانو بدلے۔ آنے والوں کے لئے حلقہ کی اگلی صف میں جگہ چھوڑی گئی —— بادشاہ کے مصاحب خدا کے گھر میں بھی اگلی صف کے حقدار ہوتے ہیں!

آنے والوں نے اپنے دل میں سوچا "اللہ اللہ! ان سے زیادہ خوش نصیب کون ہو گا۔ دُنیا میں یہ احترام اور عاقبت میں روضۂ رضواں! اور کیا چاہیئے۔ ان

کے لئے دونوں جہاں میں خوشی ہی خوشی ہے"۔

مفتی صاحب کا وظیفہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ ایک خادم گھر کی طرف سے بھاگا ہوا آیا "حضرت،" اس نے ہاتھ باندھکر عرض کیا۔ "ذرا مکان تشریف لے چلیں۔ پولیس والے چھوٹے میاں کی لاش لے کر آئے ہیں"۔

"کیا، کیا، کیا کہا، چھوٹے میاں، کون چھوٹے میاں، لاش، کیسی لاش، کیا کہا پولیس والے —— لا الہ اللہ ——"

مریدوں نے بغلوں میں ہاتھ ڈالکر سنبھالا۔ بمشکل سے مفتی صاحب گھر پہنچے۔ پولیس کے آدمی دروازے پر بیٹھے تھے۔ مفتی صاحب کو سوال کا ہوش کہاں تھا مگر مریدوں کو پولیس والوں نے بتایا کہ صاحبزادے ایک طوائف پر مبتلا تھے۔ اسی کے گھر زہر کھا لیا —— اندر اور باہر ایک کہرام تھا۔ مفتی صاحب بیہوش پڑے تھے۔

بادشاہ کے مصاحبین اپنی آنکھوں کی نمی کو رومال سے خشک کرتے ہوئے باہر آئے "یہاں بھی نہیں تو پھر کہاں؟" اُنہوں نے کہا۔ "وہ شے جو ہم ڈھونڈھ رہے ہیں، دولت کے دامن میں نہیں، دنیا کے پاس نہیں۔ مذہب کی گرہ میں نہیں، پھر کہاں؟ دولت روتی ہے۔ عزت بسورتی ہے۔ مذہب دیوالیہ ہے"۔

"پھر کہاں؟" ——

ان سب کو چھوڑو۔ اُدھر چلو جدھر دُنیا ہے نہ دین ہے۔ آؤ کسی میخانہ میں چلیں

کسی پُرانے شرابی کو ڈھونڈیں۔ کوئی ایسا شرابی جس کا نشہ کبھی نہ اُترتا ہو۔ جو دُنیا سے بے تعلق ہو جو سارے علائق کو مے خانے کے خُم میں غرق کر چکا ہو۔ جس کو نہ مرنے کا غم ہو نہ جینے کی فکر ہو۔ نہ دولت کی تلاش۔ نہ عزت کی خواہش، نہ دوزخ کا خوف نہ جنت کی جستجو

وُہ دونوں مچلنے میں آئے۔ پھٹی ہُوئی چٹائیوں پر، ٹوٹے ہوئے مونڈھوں اور کرسیوں پر، فرشِ خاک پر کوئی اکڑوں، کوئی دوزانو، کوئی کروٹ سے کوئی چت۔ کوئی دیوار کے سہارے کوئی کسی دوسرے کو تکیہ بنائے ہوئے میخواروں کی ایک دُنیا آباد تھی۔

"لاؤ، لاؤ، ایک اور، ہاں ایک اور، تلخ وہ میٹھی نہیں، تیز وہ ہلکی نہیں۔ لاؤ، لاؤ بھر کے لاؤ۔ آدھا نہیں۔ گرا‌ؤ نہیں۔ ادھر لاؤ۔ پلادو، ڈال دو۔ انڈیل دو، لاؤ، لاؤ —— نشہ نشہ، نشہ کہاں ہے، کس کو ہے؟ کیا کہتے ہو؟ مَیں سو گیا، غلط ہے۔ خدا کی قسم غلط ہے۔ مَیں نشہ میں ہوں۔ یہ بھی غلط ہے۔ واللہ افترا ہے۔ کذب ہے —— موت، موت کیسی، ایک پیالہ میں زندگی ہے۔ ہاں! وُہ بھرا نہ ہو تو موت، زندگی کو بھول جاؤ۔ موت کو یاد نہ کرو۔ لاؤ، لاؤ —— دوزخ —— ؟ جنت —— ؟ یہ کیا خرافات ہے۔ ہم جنت والے دوزخ کو کیا جانیں۔ جنت والوں سے دوزخ کا ذکر، کیسے بیوقوف ہو؟ لاؤ لاؤ، بیمار ہیں؟ کون بیمار ہے؟ بادشاہ سلامت بیمار ہیں؟ کیوں بیمار ہیں؟ بیمار ہونے کو کس نے کہا تھا۔ کھول دو ایک قرابہ، پلادو ایک مشک بھر کے، اچھے ہو جائیں گے۔ جاؤ کہدیا۔ اچھے ہو جائیں گے۔ بستر سے اُٹھیں گے جوان ہو کر! حکیم صاحب سے کہو، خوب پئیں اور پلائیں —— اتنی پلائیں —— !! مفتی صاحب، مفتی صاحب

کا کیا ذکر؟ یہاں دیکھو کتنے مفتی موجود ہیں۔ ہم سب مفتی ہیں اور ہم میں سے ہر ایک بادشاہ ہے ـــ بادشاہ ـــ جہاں پناہ !! ـــ لاؤ لاؤ"۔

"اندر آؤ، حقیقی مسرت کا ٹھکانہ مل گیا۔ منزلِ مراد یہی ہے"۔ دونوں کی اُمیدیں ہم آواز تھیں، "جو شے کہیں نہ مل سکی۔ وُہ یہاں ضرور ہے۔ ان میں سے کس کی قمیص حاصل کرنی چاہیے"۔ وُہ میخانہ کے ایک گوشہ میں بیٹھکر مشورہ کرنے لگے ـــ

ایک شخص مجمع سے ذرا بچا ہوا ایک چٹائی پر بیٹھا ہنس رہا تھا۔ ہاتھ میں اس کے ایک صراحی تھی، جھوم جھوم کر صراحی سے ایک ایک گھونٹ پیتا تھا۔ مسکراتا تھا، صراحی کو کلیجہ سے لگا کر مسکراتا تھا ـــ دونوں نے کہا:۔

"آؤ اس شخص سے باتیں کریں"۔

"آپ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں، کیا شغل ہے؟" اُنہوں نے مسکراتے ہوئے شرابی سے سوالات کرنے شروع کئے ـــ

"مَیں کون، شرابی، میرا گھر شراب خانہ، میرا شغل شراب نوشی، میری زندگی شراب، میری جنّت شراب، میری دُنیا شراب، میری عقبیٰ شراب! اور کیا پوچھتے ہو؟ آؤ! دو گھونٹ پی لو!"

"تم اس حال میں خوش ہو؟" دونوں نے سوال کیا۔

"خوش؟ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟" شرابی نے کہا "پیسہ میری جیب میں نہیں مُفت کا ایک قطرہ مجھے مل نہیں سکتا۔ چار چار دن مُحرِدم رہتا ہوں، پیاس نہیں بھرتی

مگر اس میخانے سے نکالا جاتا ہوں ــــــ خوش ؟ ــــــ کاش میرے پاس کچھ دولت ہوتی۔ اتنی تو ہوتی کہ ہر روز پی لیا کرتا! اس شہر کے دولت مند سونے چاندی کے ڈھیر مٹی کے نیچے دبائے بیٹھے ہیں۔ اللہ نے اپنی نعمتیں کس قدر غلط تقسیم کی ہیں۔ ہم بھی اُسی کے بندے کہلائے جاتے ہیں۔ ان کو اتنا کچھ اور ہم کو کچھ نہیں! ایک قدح شراب کے قابل بھی نہیں! وہ پھولوں پر سوئیں۔ ہم کانٹوں پر لوٹیں! خدا اسی کو کہتے ہیں جو ایک کو دے اور دوسرے کو نہ دے! مالک، خالق، معبود! شکوہ کرنا کفر ہے۔ شکایت کرنا گناہ ہے!" ــــــ خوش! ــــــ"

"جاؤ جاؤ ہٹو! میرا مذاق اُڑانے آئے ہو۔ پیتے نہیں۔ پلاتے بھی نہیں، اتراتے پھرتے ہو۔ دھوکا دینے آتے ہو۔ میری مفلسی مجھے یاد دلانے آئے ہو۔ مجھے ترسانے، تڑپانے! ہٹو ہٹو ــــــ ارے لاؤ ایک جام! لاؤ لاؤ!"

"بس کیا دیکھنے آئے تھے کیا دیکھا! شراب کی مستی اور کیف کہاں۔ وہ تو دولت کا ماتم کر رہا ہے۔ مسرت کو وہ بدنصیب کیا جانے! دُور سے پھول نظر آتا ہے۔ نزدیک جاؤ تو کانٹے ہی کانٹے ہیں! زندگی کے ریگستان میں کیا سب سراب ہی سراب ہیں؟" وہ دونوں مایوس اور حیران میخانے سے نکلے!

اب کدھر چلیں؟ شہر تو دیکھ لیا، چلو جنگل کی طرف چلیں۔ کیا معلوم پہاڑ کی کسی گھاٹی میں، جنگل کے کسی گوشے میں، خدا کا کوئی بندہ، جیسا ہم ڈھونڈ رہے ہیں مل جائے۔"

ہفتوں وہ بیابانوں اور جنگلوں میں گھوما کئے۔ دیہات میں اور بستیوں میں، دریاؤں کے کنارے، مسجدوں اور مندروں میں، پہاڑوں کی گھاٹیوں میں وہ ڈھونڈتے پھرے۔

ایک دن ایک گاؤں کی آبادی کے باہر ایک کچی سڑک کے کنارے ایک برگد کے سایہ میں اُنہوں نے ایک جھونپڑی کے سامنے ایک نوجوان فقیر کو بیٹھے دیکھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی سخت تھی۔ لُو چل رہی تھی۔ اِکّا دُکّا مسافر جو اس راستے سے گزر رہے تھے جھونپڑی کے سامنے سایہ میں کچھ دیر دم لیتے تھے۔ فقیر ان کو پانی پلاتا تھا۔ اپنی جھونپڑی میں سے کچھ بُھنے ہوئے چنے لاتا اور ان کے سامنے پیش کرتا۔ وہ کچھ کھاتے، دو گھونٹ پانی پیتے، کچھ سستاتے اور روانہ ہو جاتے۔ اس نوجوان فقیر کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نور تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک کیف تھا۔ دونوں مصاحب گرمی اور لُو کی تکلیف سے تنگ آچکے تھے۔ درخت کے ٹھنڈے سایہ اور فقیر کی شگفتہ صورت نے ان کے قدموں کو جھونپڑی کے سامنے روک دیا۔ فقیر کے مٹکے کا ٹھنڈا پانی۔ برگد کی چھاؤں اور جنگل کا سناٹا۔ یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ وہ دونوں مسافر سستانے کیا بیٹھے بالکل بیٹھ ہی گئے۔ فقیر سے اُنہوں نے اجازت چاہی کہ دوپہر ڈھلنے تک وہ جھونپڑی کے پاس آرام کر لیں۔ لیٹے لیٹے اُنہوں نے فقیر سے باتیں شروع کیں۔ "کیوں بابا! تم کب سے اس جھونپڑی میں رہتے ہو؟"

"جب سے میں پیدا ہوا اور میں پیدا اس وقت ہوا جب دُنیا کی خواہشیں میرے دل میں مر گئیں۔ ان کی موت میری زندگی ہے"۔ فقیر نے کہا۔

"اب تم کیا کرتے ہو؟"

"مسافروں کی خدمت کرتا ہوں اور اس جھونپڑی میں پاؤں پھیلا کر سوتا ہوں" فقیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تمہیں کوئی فکر نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں؟" دونوں مصاحبوں نے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

"فکر؟ خواہش فکر کی ماں ہے۔ اس کے بطن سے یہ تکلیف دہ بچہ پیدا ہوا کرتا ہے۔ مَیں خواہش نہیں رکھتا۔ پھر میرے گھر میں فکر کہاں سے آئے؟"

"تم اپنی زندگی میں مطمئن ہو۔ آرام سے ہو؟"

"مَیں مطمئن ہوں۔ خوش ہوں۔ آرام سے ہوں۔ میرا کسی ایسی چیز سے واسطہ ہی نہیں جو غیر مطمئن، ناخوش یا بے آرام کر سکے۔"

"خدا کا شکر ہے ہم نے تم کو پا لیا" دونوں بے اختیار بول اُٹھے۔ "ہم کو تم ہی جیسے انسان کی تلاش تھی۔" پھر انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ "بادشاہ بیمار ہے۔ اس کے علاج میں تمہاری امداد کی ضرورت ہے۔" فقیر سنتا رہا۔ سُن کر بھی خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"بابا! مَیں بادشاہوں کو کیا جانوں۔ مَیں جس دُنیا میں ہوں۔ وہاں بادشاہ ہوتا ہی نہیں۔ خیر تم کہو، تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم بادشاہوں کی نہ سہی انسانوں کی خدمت تو کرتے ہو۔ ہماری کچھ امداد کرو۔"

"ہاں!" فقیر نے کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے۔ خوشی کے ساتھ تم کو دے سکتا ہوں"

تمہارے کام آئے تو میری جھونپڑی اُٹھا لے جاؤ۔"

خوش ہو کر دونوں نے کہا "بس ہمیں اپنی پھٹی پُرانی قمیص دے دو۔"

"برسیں ہو گئیں۔ میرا جسم قمیص سے ناآشنا ہے۔ دُنیا چھوڑی دُنیا والوں کا لباس چھوڑا۔ میرے جسم کی کھال میرا لباس ہے۔ شاید اسی لئے میں مطمئن بھی ہوں، بابا قمیص میرے پاس نہیں!"

بادشاہ اب تک بیمار پڑا ہے۔ مصاحبین ملکوں ملکوں ڈھونڈ آئے۔ کوئی ایسا نہ ملا۔ جس کی قمیص بادشاہ کے مرض کا علاج ہو سکتی اور ایک جو ملا۔ اُس کے جسم پر قمیص ہی نہ تھی!!

(۱۹۳۳ء) (اناطول سے)

دیوتاؤں کا صدقہ

اشخاص :-

کلاڈیس بالبو	.. ..	ایک رومی امیر جو اپنی بیوی کی بدچلنی سے واقف ہے
لینٹولس	.. ..	روما کا ایک نوجوان امیر زادہ جس سے بالبو کی بیگم کے ناجائز تعلقات ہیں ۔
جولیا	.. .. ..	بالبو کی بدچلن بیوی
گالیا	.. .. ..	بالبو کا سیکرٹری
لوکسٹا	.. ..	بالبو اور جولیا کی کنیز جو زہر دیکر قتل کرنے کے فن میں دستگاہ رکھتی ہے !

منظر

(دوپہر ڈھل چکی ہے۔ آفتاب کی تمازت کم ہوتی جاتی ہے۔ کلوزیم کی دیواروں کا سایہ لمبا ہوتا جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب روما کے رؤسا، اور امرا، اپنے محلوں کے برامدوں میں نکل آتے ہیں۔

کلاڈیس بالبو کا محل بنیاد سے گنبد تک خالص مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس محل کے ایک مدہ میں بالبو اپنی بیگم کے عاشق لینڈس کے ساتھ پانسہ کا کھیل کھیل رہا ہے۔ یہ دونو مرمر کی نیچی چوکیوں پر رکھے ہوئے ریشم کے موٹے گدوں پر کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے ہوئے کھیل میں مشغول ہیں)

بالبو۔ کھیلو۔ کھیلو۔ پھینکو، پانسہ کو روکتے کیوں ہو۔ کس چکر میں ہو؟ (آنکھ مار کر اور سر ہلا کر محل کے دروازہ کی طرف دیکھتا ہے)

لینٹولس۔ ہوں، کیا کہا، پانسہ؟ پانسہ تو پھینک رہا ہوں۔ یہ دیکھو یہ مارا۔ لو چلو اٹھاؤ پانسہ!

بالبو۔ (ایک ہونٹ دانتوں کے نیچے دبا کر) تمہارا پانسہ تو سیدھا پڑ رہا ہے۔ مگر کب تک؟ ایسا لوٹے گا کہ یاد کروگے! پانسہ کے بھروسہ پر نہ رہنا۔ میرا ہاتھ ابھی نہیں دیکھا!

لینٹولس۔ اجی سب دیکھ لیا۔ دیکھ چکے تمہارا ہاتھ (پانسہ پھینک کر) پانسہ یوں

پھینکتے ہیں۔ دیکھا؟ اب ذرا سنبھل کر پھینکو!
(اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ دل ہی دل میں باتیں کرتا ہے۔ پانسہ، پانسہ سیدھا پانسہ تو میرا ہے۔ اِس گدھے کا پانسہ تو اُلٹا پڑ چکا! نرا اُلّو کا پٹھا ہے جو رو کو میں لئے جاتا ہوں۔ شوہر آپ ہیں! دیوتاؤں کی دل لگی بھی عجیب ہے۔ جولیا جیسی پری کا جوڑا لگایا تو اِس لنگور کے ساتھ! واہ میرے دیوتاؤ!)

بالبو۔ کیا منمنا رہے ہو۔ لو پھینکو آخری ہاتھ!

(جولیا محل کا پردہ اٹھا کر آتی ہے۔ اس کا لباس بھی اتنا ہی حسین اور دلکش ہے جس قدر وہ خود حسین ہے۔ رخسار اور ہونٹ غازہ کی سرخی سے گلاب کی طرح سُرخ ہیں۔ اُس کے جسم پر جواہرات جگمگا رہے ہیں)

جولیا۔ (بالبو کی طرف منہ بنا کر) لینیٹولس سے پانسے پھینکوا رہے ہو! تمہیں خبر نہیں کہ وہ مجھے ساتھ لیکر اس وقت کلوزیم جانے والا ہے۔ تم کو تو پانسہ پھینکنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ اور جب پھینکو گے اُلٹا۔

بالبو۔ بیگم صاحبہ! معاف فرمایئے (منہ بنا کر) مجھے کیا خبر تھی۔ کہ لینیٹولس کو ساتھ لیکر آپ تماشہ دیکھنے جا رہی ہیں، لے جایئے (لینیٹولس سے) جایئے جناب جایئے تشریف لے جایئے مہربان، بیگم صاحبہ کو کلوزیم کا تماشہ دکھانے لے جایئے!! (ذرا گرم ہو کر) جاؤ، تم دونوں جاؤ۔ میں کب کہتا ہوں کہ نہ جاؤ۔

ایسے جاؤ۔ ایسے جاؤ کہ پھر واپس بھی نہ آؤ!!

جولیا۔ (جاتے جاتے رک کر) کیا فرمایا؟ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟ نہیں چاہتے کہ میں واپس آؤں؟ تو پھر قصہ ختم کرو، میرا مہر مجھے دو۔ پورے دو لاکھ جیب سے نکالو! میں کب تم جیسے گدھوں کے اصطبل میں ٹھہرنا چاہتی ہوں مگر جاؤں گی اپنا مہر لے کر ——— اور تمہاری صورت کو آگ لگا کر! (زور سے دروازہ بند کرتی ہے اور محل سے نکل جاتی ہے)

بالبو۔ (سخت غصّہ کی حالت میں ٹہل رہا ہے اور بڑبڑاتا جاتا ہے)۔ دیکھوں گا۔ دیکھوں گا۔ سمجھوں گا! طلاق لے گی؟ مہر لے گی؟ تُو اور تیرا لینٹولس (دروازہ کی طرف مکّا دکھاتا ہے) لے! مجھ سے اپنا مہر لے اور لینٹولس کی بغل میں جین کر! (آواز دیتا ہے) گلبا! گلبا!

(گلبا داخل ہوتا ہے)

بالبو۔ جاؤ ان دونوں کے پیچھے جاؤ، لوکسٹا کو بلاؤ۔ اس سے کہو۔ کہ جس وقت یہ دونوں واپس آئیں۔ تو ان کے لئے تیز شراب کا ایک آخری جام تیار رہے سمجھ گئے میرا مطلب!

(گلبا جاتا ہے۔ اور بالبو کمرہ میں بڑبڑاتا ہوا ٹہل رہا ہے)

بالبو۔ طلاق، مہر، لینٹولس کی معشوقہ، لوکسٹا کی شراب پی، ایک جام پی لے میری پیاری بیگم! بیگم صاحب کی عمر کا پیالہ چھلکنا چاہیئے۔ آج رات کے کھانے کے بعد

ناہید دیوتا کی قسم، میں بغیر جولیا کا مہر ادا کیے۔ انجیر تپنیا سے شادی کرسکونگا
دیوتاؤں کا صدقہ!"

دوسرا سین

(محل کے باہر سڑک پر)

لینٹولس۔ کیوں جانِ من! وہ حلوا ابھی تیار کر لیا۔ جو آج شب کو بالبو صاحب نوش فرمائیں گے؟

جولیا۔ (مسکرا کر) نہیں تو ہنگر میری کنیز لوکستا تیار کر رہی ہے مطمئن رہو۔ وہ اپنے فن کی ماہر ہے۔ ناہید دیوتا کا سایہ ہم دونوں کے سر پر ہے حلوہ بہت میٹھا بہت مزے کا ہوگا۔ میں نے لوکستا کو سمجھا دیا ہے کہ شکر زیادہ ڈالے! میرے عزیز شوہر حلوہ کھا کر سو رہیں گے! نہ طلاق۔ نہ مہر۔ بس لوکستا کا حلوہ میرے معزز شوہر کے حلق میں! دیوتاؤں کا صدقہ!"

پردہ

ڈپٹی صاحب کا کتّا

داروغہ جی محلہ کی سڑک پر خراماں خراماں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بید کا ٹکڑا ہے جس کی دم میں چمڑے کے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگے ہوتے ہیں۔ وہ اس کو اس طرح ہلاتے اور گھماتے چلے جاتے ہیں کہ چمڑے کے ٹکڑوں کا ایک پھول ہوا میں بن جاتا ہے۔ سیاہ فام چہرہ پر گھنی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ ہیں۔ جن کی گرفت میں ایک سلگتا ہوا سگریٹ ہے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے وہ ہر طرف دیکھتے جاتے ہیں ——— گویا محلہ کے ہر در و دیوار پر اور ہر دروازے میں اُنہیں ایک چھپا ہوا چور نظر آنے والا ہے!

سڑک پر کھیلتے ہوئے بچّے داروغہ جی کو دیکھ دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کے

دروازوں کی طرف بھاگنے لگے!

محلہ کی پنہیاریوں نے راستہ چھوڑ کر اپنے گھونگھٹ لمبے کر لئے! —— اس طرح داروغہ جی محلہ میں شام کا پھیرا لگا رہے ہیں!!

"کیوں بے، دیکھتا نہیں، سالے"!

بھنگی نے جھاڑو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے سلام کیا۔ داروغہ جی نے جیب سے رومال نکال کر اپنی ناک کو لگایا: تاکہ سڑک پر بھنگی کی جھاڑو سے جو خاک اڑ رہی تھی۔ وہ ان کی سریع الحس ناک میں داخل نہ ہونے پائے۔

"خانصاحب! ہم دیکھتے ہیں، تمہارے ہاں اب تاش بہت کھیلا جاتا ہے"!

خانصاحب معہ اپنے احباب کے گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے!۔

"آئیے داروغہ جی! آئیے، حقہ تو پیتے جائیے"۔

"کیوں جی! گیہوں کا بھاؤ پھر تم نے بڑھا دیا؟"

بنیا دکان سے اتر کر سڑک پر آ گیا!۔

"نہیں تو حجور!" اس نے گڑگڑا کر کہا: "بھلا سرکاروں کے لئے بھاؤ تاؤ کیا"!

"ادھر آ بے!" داروغہ جی نے ایک لونڈے کو جو گائیں ہنکائے لئے جا رہا تھا، بلایا "دیکھ! تیرے گھر تازہ مکھن ہو تو اپنی ماں سے کہنا۔ ایک پاؤ بھر تھانہ میں پہنچا دے!"

داروغہ جی اپنے چمڑے کا ٹکڑا گھماتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ انا نائی کی دکان کے سامنے ایک کتا بیٹھا ہوا تھا۔ کیا جانے کیا سمجھ کر وہ بھونکنے لگا۔

"کیوں بے" داروغہ جی کتے سے مخاطب ہوتے "بہت دانت نکالتا ہے۔" ایک چابک لگا کر۔

"اور لے گا؟" محلہ والوں کی طرف مخاطب ہو کر "کیوں جی تم لوگ ان کھٹکنے کتوں کو مارتے بھی نہیں —— عجیب لوگ ہیں اس محلّے کے —— معلوم ہے قانون کیا کہتا ہے؟ قانون کہتا ہے۔ کہ کاٹنے والے کتے کو فوراً مار دیا جائے —— مارنا تو ذرا دو لاتیں اس مردود کے، بھونکے جاتا ہے!"

دو ایک آدمی دوڑ پڑے کتے کا ٹیا پکڑ کر اس کو وھپانا شروع کیا۔ کتا ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہا ہے۔ داروغہ جی نے اپنا چمڑے کا ٹکڑا بغل میں اور سگریٹ منہ سے نکال کر انگلیوں میں دبا لیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں روشنی بڑھ گئی ہے!

"مارو سالے کو، بہت گلا پھاڑتا ہے۔ موذی ہے سالا!"

اب تو محلّے کے بچے بوڑھے، جوان سب ہی سمٹ آئے۔ دکاندار بھی اپنی دکانوں کے تختوں سے اٹھ کر سڑک پر آ گئے —— داروغہ جی کے حکم سے کتا پیٹا جا رہا ہے!

محلّے کے دوسرے سرے کی دکان پر ایک "جوان" بھی بیٹھا ہوا حقّہ پی رہا تھا۔ اس نے جو سنا کہ داروغہ جی محلہ میں آ گئے۔ تو وہ بھی اپنی پیٹی کمر میں اور صافہ سر پر درست کرتا ہوا اٹھا —— محلے والے جمع ہیں۔ داروغہ جی پہلا سگرٹ ختم کر کے دوسرا

سلگا رہے ہیں اور کتا پٹ رہا ہے!

کتا چھوٹی نسل کا بھورے بالوں والا خاصا خوبصورت کتا تھا۔ کبھی نانبائی کی دکان کے سامنے آجایا کرتا تھا۔ مزاج کا ذرا کڑوا تھا اور کمبخت کو داروغہ اور غیر داروغہ کی پہچان نہ تھی!

اس وقت اسکی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ڈم ٹانگوں کے اندر مڑ کر گویا چپک گئی تھی۔ زبان ایک انچ سے زیادہ باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کا ہر انداز رحم طلب تھا۔

"یہ کتا کہیں چھوٹے صاحب کا نہ ہو" کانسٹبل نے داروغہ کے کان سے منہ ملا کر کہا۔

"ارے کس کا ہے یہ کتا؟" داروغہ جی نے محلہ والوں سے سوال کیا۔ مارپیٹ اب بند ہو گئی۔

شیخ جی! جو ابھی ابھی شور پکار سنکر مسجد سے نکلے تھے۔ دبی زبان سے کہنے لگے:۔

"یہ کتا تو، صاحب میرے، وہی نا، جو نئے ڈپٹی صاحب آئے ہیں، انکا معلوم ہوتا ہے!"

ایک لونڈا بول پڑا!۔

"دیکھا تو ان ہی کے دروازے پر ہے، داروغہ جی!"

داروغہ جی نے سگرٹ کی جلتی ہوئی دم نالی کی طرف پھینک دی۔ کچھ کھانسے

"بھئی کتا تو اچھی نسل کا ہے۔ ہو نہ ہو۔ ڈپٹی صاحب ہی کا ہوگا۔ ذرا ادھر تو لاؤ اسکو"۔ کتے کے سر پر انہوں نے ہاتھ پھیرا:۔

"اچھا کتا ہے۔ نئے ڈپٹی صاحب آدمی شوقین ہیں"!

پھر کتے کے سر پر تھپکی دی۔ وہ مانوس نہیں ہوتا۔ دُم اس کی ابھی تک ٹانگوں کے اندر ہے۔ اب وہ چیختا تو نہیں۔ مگر غرائے جاتا ہے۔

"مزاج کا ذرا گرم ہے۔ یہ کتا ——— یہی تو علامت ہے اس بات کی کہ اچھی نسل کا ہے"!

یہ کہہ کر داروغہ جی نے محلہ والوں کی طرف دیکھا۔ گویا اپنی پہچان اور شناخت کی داد چاہتے ہیں۔ کلو نان بائی نے اپنی دکان کے تختہ پر سے پکارا:۔

"اجی نہیں داروغہ جی! یہ سسرا تو روز میری دکان کے سامنے بیٹھا رہتا ہے بھلا ڈپٹی صاحب کا کتا ایسا کیوں ہونے لگا"!

کسی نے جواب دیا:۔

"نہیں جی، پاگل ہو، اس کا پٹا نہیں دیکھا، پالتو ہے جی، بازاری نہیں ہے"۔

داروغہ جی نے تیسرا سگرٹ سلگایا۔ ان کا پارہ ذرا چڑھنے لگا:۔

"ارے میاں، تم اتنے محلہ والے ہو کسی کو معلوم نہیں کہ کتا کس کا ہے عجب بے خبر لوگ ہو تم! اس محلہ کا باوا آدم ہی نرالا ہے"!

"ہاں صاحب! ہاں صاحب! ہمیں معلوم ہے۔ یہ کتا ڈپٹی صاحب کا ہے۔ تم

نے ہزار دفعہ اُس کو ان کی کرسی کے پاس بیٹھے ہوا دیکھا ہے؟"

"ارے میاں! تم بھی عجیب آدمی ہو خانصاحب" داروغہ جی نے جلدی سے فرمایا "کھڑے دیکھ رہے ہو۔ کتا غریب پٹ رہا ہے۔ اور روکتے بھی نہیں۔ بھلا یہ کیا ظلم ہے کہ سب کے سب غریب کتے پر ٹوٹ پڑیں ـــــ چھوڑ دو، اس کا پٹا۔ چھوڑ دو جی! معلوم نہیں کہاں سے گھیر گھار کر اس کو لے آئے اور کہتے ہو کہ دکان کے سامنے پڑا رہتا ہے! معلوم نہیں تم لوگوں کو؟ جانوروں پر ظلم کرنے کے متعلق کس قدر سخت قانون ہے ابھی چاہوں تو دو چار کا چالان کر دوں! غضب خدا کا، غریب کتا۔ کس بری طرح پیٹا گیا ہے۔ تم لوگ انسان ہو یا جانور، بے زبان جانور پر یہ ظلم! اس وقت میں نہ آگیا ہوتا تو تم لوگ تو مار ہی ڈالتے ڈپٹی صاحب کے کتے کو!"

کانسٹبل کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے:۔

"لے بھئی، ذرا اٹھا تو لے اس غریب کو سنبھال کر۔ چل ڈپٹی صاحب کے یہاں پہنچا دیں!"

محلہ والوں کی طرف رخ کر کے:۔

"دیکھو جی! خبردار! آئندہ ایسی حرکت نہ کی جائے۔ ورنہ باندھ لے جاؤں گا۔ دس پانچ کو!"

سُراغرسان

اکتوبر کے مہینے کی ۶ تاریخ تھی اور سال تھا ۱۸۸۵ء۔ ۸۵ نہ ہوگا تو ۸۶ ہوگا۔ غرض تھے گلابی جاڑے۔ ایک فردکی سردی تھی۔ صبح صبح تھانہ میں بھنگی جھاڑو لگا رہا تھا۔ اور داروغہ جی برآمدہ میں اپنے پلنگ پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے، حقّہ پی رہے تھے۔ منہ اُن کا ابھی باسی تھا۔ رات کے جمع شدہ چیپڑ ہنوز آنکھوں کے کویوں میں جمع تھے۔

ایک شخص بھاگا ہُوا آیا:۔

"سلام داروغہ جی! غضب ہوگیا داروغہ جی! غضب ہوگیا سرکار!"

"ابے غضب کے بچے کچھ کہتا بھی ہے یا خواہ مخواہ چیخے جاتا ہے۔" داروغہ جی

نے چڑچڑا کر فرمایا۔

"داروغہ جی بڑا بھاری قتل ہو گیا۔ ہمارے میاں کو کسی نے مار ڈالا ـــــ ہائے ہائے!"

"کون ہے تیرا میاں، ابے کس نے مار ڈالا، صاف صاف سیدھی سیدھی بات کر، ورنہ دوں گا ایک لات!"

"اجی سرکار! ہمارے میاں خداداد خاں زمیندار ننوکھیڑہ کل شام تو اچھے خاصے تھے اور اب کمرہ کا دروازہ بند ہے۔ پکارتے پکارتے میں تو تھک گیا۔ دروازہ پیٹا آوازیں دیں، گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔"

"ابے کہرام سے ہمیں کیا کام مرغی کے! یہ بتا وہ رات گئے کہاں تھے؟"

"کہیں نہیں سرکار ـــــ اب سرکار کو تو معلوم ہی ہے۔ ان کا آنا جانا موہنی طوائف کے یہاں تھا۔ وہیں سے شام کو واپس آئے تھے بس پھر تو کہیں گئے نہیں۔ وہ تو داروغہ جی اچھے خاصے تھے۔ ہائے ہائے یہ کیا ہو گیا سرکار! ہائے ہائے!"

"سن بے حرامزادہ! جو پوچھوں وہ بتا۔ بک بک کریگا تو ابھی منہ ٹیڑھا کر دونگا۔ ہاں، بتا اب کس نے قتل کیا اُن کو ـــــ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"اے لو! سرکار بھلا مجھے کیا معلوم؟ یہ تو سرکار آپ ہی معلوم کریں گے!"

"کیوں بے! ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں، ہم معلوم کریں گے۔ اور تو نہ بتائیگا، بتا، بول! ـــــ نہ بتائے گا؟ اٹھوں پھر میں؟"

"سرکار! اولاد کی قسم مجھے معلوم نہیں۔"

"اولاد کا جنا! حرامی سالا! ——— ارے کوئی ہے، ذرا لے تو جاؤ اس اولاد کے جنے کو حوالات میں! ان حرامزادوں کو یہ تو خبر ہے کہ اُن کے آقا صاحب قتل کر دئے گئے، مگر یہ معلوم نہیں کہ کس نے قتل کیا ——— ہم سے پوچھتا ہے سالا ——— ہم ان کو بتائیں ——— لینا منشی جی! ذرا تھوڑی سی ٹھکنتی تو کر ڈالو۔ باز خاں کے سپرد کرو۔ وہ اس کا مزاج درست کر لیں گے ———"

مقتول زمیندار صاحب کے دروازہ پر کانسٹبل ٹہل رہے ہیں۔ داروغہ جی وردی پہنے، ہیٹی لگائے محلہ کے لوگوں کے بیانات لے رہے ہیں:۔

ہاں تو مقتول شراب بہت پیتا تھا۔ موہنی طوائف سے اس کا تعلق تھا۔ اور بیوی سے کس بات پر جھگڑا ہوا کرتا تھا؟ ——— بتاؤ جی، صاف صاف کہو۔

ہاں! تو وہ موہنی کے گھر سے شام کو کس وقت آیا تھا، تم نے واپس آتے دیکھا کوئی سات بجے کے قریب، ٹھیک! پھر تم سے کچھ بات کی تھی؟ بات نہیں کی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے، جھوٹ مت بکو۔ سچ سچ بات کہو۔ شراب پئے ہوئے تھا۔ نشہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر تم سے بات کیوں نہیں ہوئی؟ نشہ کی حالت میں تو ضرور بات ہونی چاہئے تھی ——— جھوٹے ہو تم۔ بکواس نہ کرو ——— یہ کیا بھید ہے کہ تم نے اس سے بات نہیں کی۔ اچھا مان لیا کہ اس نے بات نہیں کی۔ مگر تم نے کیوں بات نہ کی؟ تمہیں سانپ سونگھ

گیا تھا؟ تمہاری زبان کو دیمک چاٹ گئی تھی؟ کیوں جی؟ نہیں بتاؤ گے؟ اچھا مجھے بھی دیکھا ہے ٹیڑھی انگلیوں سے صاف گھی نکال لیتا ہوں۔ ہونہہ! جمعدار ذرا لیجاؤ اِس بدمعاش کو حوالات میں ——— ہم آتے ہیں ——— ابھی ———

اب داروغہ جی نے موقعہ کا معائنہ شروع کیا۔

دوسری منزل پر وہ کمرہ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا باہر کی طرف ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ داروغہ جی نے بہت غور سے اس کو دیکھا!

"اگر کوئی گھر کا آدمی نہیں ہے تو وہ ضرور اِدھر سے چڑھ کر داخل ہوا اور ادھر ہی سے نکل گیا۔ ذرا دیکھنا باہر کی دیوار پر کوئی نشان تو نہیں ہے"

دیوار پر نشان بہت تھے لمبے، سیدھے، گول ہر قسم کے نشان تھے؛

"اچھا اب دیوار کے نیچے زمین پر دیکھو" ڈبیا میں سے پان نکال کر کھاتے ہوئے داروغہ جی نے ہدایت فرمائی۔ بارش ہو چکی تھی، نرم زمین پر انسان اور جانور کے قدموں کے سینکڑوں نشانات موجود تھے۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ رات میں اِدھر سے آیا ——— ادھر ہی سے آیا ——— ادھر سے نہ آیا تو پھر کدھر سے آیا؟ داروغہ جی نے حاضرین کی طرف نظر کر کے اس سوال پر زور دیا کہ گویا کسی نے ان کی رائے پر اشتباہ ظاہر کیا ہے) بیشک اُدھر سے آیا مگر چڑھا کیسے؟"

"جی صاحب، چڑھنے کا کیا ہے، چڑھ گیا ہوگا رسّی باندھ کر، بانس رکھکر

ایک محلہ والے نے لقمہ دیا——"

"پاگل ہو" داروغہ جی نے جھڑکا "کہیں قیاسیات سے سراغ رسانی کی جاتی ہے پکے نشانات اور اشارے ملنے چاہئیں۔ اچھا اب دیکھو۔ یہاں قریب کوئی سیڑھی موجود ہے یا نہیں؟"

زمیندار صاحب کے اصطبل میں ایک بانس کی سیڑھی رکھی ہوئی ملی۔"

ہاں اب دیکھو، بات سمجھ میں آئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند—— دیوار پر نشان —— سیڑھی موجود —— قاتل کا راستہ معلوم ہو گیا!!" داروغہ جی نے خاص طور پر اُن صاحب کی طرف نظر کر کے فرمایا جنہوں نے رسی اور بانس کا ذکر کیا تھا"

"کھڑکی کھلی ملی ہو گی۔ قاتل اندر گھس آیا ہو گا۔ بھئی مقتول تو ہمیشہ کے بےفکرے تھے ہی۔ ہم تو جانتے تھے۔ کہ کسی دن یہ حشر ہونے والا ہے۔ عیاشی۔ شراب خوری بُری صحبت۔"

ناصحانہ انداز میں داروغہ جی نے اپنے شانے ہلا کر افسوس کا اظہار فرمایا۔"کیوں شیخ جی! میں کچھ غلط کہتا ہوں؟ سیدھے سادھے چلتے تو آج اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوتے۔ اب مرے پڑے ہیں۔ بھائی خدا بچائے!"

"ہاں صاحب خدا بچائے" محلہ والوں نے آواز میں آواز ملائی۔

"ارے میاں! ہم سے کیا کہتے ہو۔ ہم تو روزانہ ایسے سینکڑوں تماشے دیکھا کرتے ہیں——"

کمرہ کے دروازہ میں باہر سے قفل لگا کر مہر کر دی گئی۔ کھڑکی کے نیچے ایک کانسٹبل مقرر کیا گیا اور داروغہ جی محلہ والوں کو سمیٹ کر تھانہ میں آگئے۔ چلتے وقت مقتول کے کسی عزیز نے مقتول کی لاش اور کفن دفن کا کچھ ذکر کیا۔ داروغہ جی پل پڑے۔ "ارے میاں کچھ عقل بھی ہے۔ ابتدائی تحقیقات تو ہو لینے دو۔ ابھی تو جناب میں لاش کو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں گا۔ ایسی گھبراہٹ کیا ہے۔ آخر کفن دفن تو ہونا ہی ہے، اب نہیں دس گھنٹہ بعد سہی۔"

یہ کہہ کر داروغہ جی چلے۔ داروغہ جی کے پیچھے چھ کانسٹبل۔ کانسٹیبلوں کے پیچھے محلہ والے، محلہ والوں کے پیچھے محلہ کے لونڈے اور محلہ کے لونڈوں کے پیچھے محلہ کے دو تین کتے!

تحقیقات کی پہلی منزل ختم ہوئی۔

کھانا کھا کر، حقہ پی کر، داروغہ جی نے تھوڑا سا قیلولہ کیا۔ اس کے بعد پھر اپنی چھجے دار پگڑی سر پر رکھ کر معائنہ موقع فرمانے کی غرض سے نکلے مکانوں کے چاروں کونوں پر کانسٹیبل کھڑے تھے۔ کمرہ کے دروازہ کا تالا داروغہ جی نے خود کھولا۔ آگے آگے وہ، ان کے پیچھے جمعدار صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔

"دیکھو جمعدار۔ کوئی اندر نہ آنے پائے۔ نوجوان افسران اکثر یہی تو غلطی کرتے ہیں کہ روک ٹوک نہیں کرتے۔ لوگ موقع واردات پر جمع ہو جاتے ہیں جرم کے نشانات مٹ جاتے ہیں کسی کو مت آنے دو۔"

یہ حکم دے کر داروغہ جی نے تفتیش کی دوسری منزل میں قدم رکھا۔

کمرہ کی حالت یہ تھی :۔

دروازہ پر میلے ململ کے پردے۔ فرش پر ایک پرانا قالین۔ ایک کونے میں کھڑکی کے پاس ایک مسہری جس کے پردے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے۔ بستر کی چادر اور تکیہ کے غلاف میلے۔ ایک کونے میں جوتوں کے چند جوڑے۔ ان پر گرد جمی ہوئی۔ مسہری کے پاس ایک چھوٹی میز پر ایک گلاس اور راکھدانی۔ فرش پر سگریٹوں کے بہت سے ٹکڑے"

داروغہ نے بہت احتیاط کے ساتھ بستر کی لٹکتی ہوئی چادر کو اٹھا کر مسہری کے پیچھے جھانکا۔ وہاں دس بارہ وسکی کی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور ایک دو ٹوٹے ہوئے گلاس۔ پھر داروغہ جی نے کھڑکی سے جھانکا۔

"بہت اونچی ہے۔ ضرور سیڑھی لگائی گئی ہوگی۔ دیکھو جمعدار انگلیوں کے نشانات ادھر دیکھو۔ ان کواڑوں پر۔ ان کا فوٹو لینا ہوگا۔ اور یہ بوتلیں سب اٹھانے لے جاؤ اور یہ ٹوٹے ہوئے گلاس بھی اور یہ راکھدانی بھی اور ——— یہ تو دیکھو۔ قالین پر یہ دھبا کیسا ہے؟ ہے تو سرخی مائل تعجب نہیں کہ خون کا دھبہ ہو ——— اس کو بھی لیجاؤ اٹھا کر ———"

"مگر" جمعدار نے کہا "سرکار مقتول کی لاش کہاں ہے؟"

"تو بہ! عجب گھونگے ہو۔ جو بات آدمی کی سمجھ میں نہ آئے۔ اسکا کہنا کیا ضرور ہے۔ پہلے قاتل کا کھوج تو لگاؤ۔ مقتول کی لاش بھی مل جائے گی۔ اور اگر نہ بھی ملے تو بھی قتل تو قتل ہے۔ ابھی تو زندہ کو پکڑو۔ مردہ تو مردہ ہے۔ اس کی فکر پھر کر لینا ——— سمجھے؟"

داروغہ جی نے بہت پُر معنی لہجہ میں کہا: "سمجھے؟"

"لیکن سرکار" بے عقل جمعدار نے پھر کہا۔ "اگر قتل اسی کمرہ میں ہوا تو پھر لاش کہاں گئی؟"

"اونہہ! کیا کوڑھ مغز ہو، ارے بھائی قتل ہوا۔ یہ تو مانتے ہو نا کہ قتل ہوا؟ اچھا اب یہ بھی مان لیا کہ اسی کمرہ میں ہوا، بہتر! اب یہ بتاؤ کہ قاتل کہاں گیا؟ قاتل اگر مل گیا۔ تو مقتول کی لاش کا بھی پتہ مل جائے گا اور وہ نہ ملا تو پھر لاش ملے یا نہ ملے۔ سب یکساں ہے! بھائی میرے! ان باتوں کو سمجھنے کے لئے تجربہ چاہیئے تجربہ —— یاد نہیں پچھلے سال اس سوداگر کا قتل! لاش کو قاتل کہاں سے کہاں لے گئے تھے۔ اب تو جمعدار تم یوں سمجھ لو کہ ارتکاب جرم تو ہوا۔ لاش نہیں ہے نہ سہی، البتہ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ اگر لاش اس کمرہ میں نہیں تو قاتل ایک آدمی نہ تھا۔ کم از کم دو ہوں گے جو لاش کو اُٹھا کر لے گئے —— یہ دیکھو کیا ہے تکیہ پر خون کا نشان —— اگر تکیہ پر خون کا دھبّہ ہے تو سمجھ لو کہ سوتے میں قتل کیا گیا۔ اچھا تو اُٹھاؤ یہ تکیہ بھی لو۔ پیلو تھانہ کو۔"

"اس بوٹ کے تسمے کہاں ہیں؟" ایک جوتے کو ٹھوکر مار کر داروغہ جی نے فرمایا "دونوں تسمے نکال لئے گئے ہیں —— اس سے کیا پتہ چلتا ہے! کچھ سمجھے جمعدار؟" پھر جمعدار کے جواب کا انتظار کئے بغیر "اگر یہ خون کے دھبے خون کے دھبے نہیں ہیں۔ تو اغلب یہ ہے کہ جوتوں کے تسموں سے گلا گھونٹا گیا ہے —— یہ ذرا دور کی کوڑی ہے ——" داروغہ جی مسکرائے "کیوں جمعدار —— ہے

پٹنے کی بات ہے"

اتنے میں پولیس کے ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لائے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئے۔ جیسے ٹہلتے ہوئے کلب میں جا رہے ہیں۔ ایک اخبار ان کے ہاتھ میں تھا!

"ارے میاں داروغہ جی، سُنا تم نے، سرحد پر جنگ شروع ہوگئی بھئی یہ سرحدی پٹھان بھی بلا کے بے درماں ہیں۔ اخبار کہتا ہے کہ سرحد کی طرف فوجیں جا رہی ہیں ـــــ اب پھر چلے گی کچھ روز ـــــ"

داروغہ جی کو نہ سرحد کی جنگ سے کوئی دلچسپی تھی نہ سرحد کے پٹھانوں سے۔ اُنھوں نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا:۔

"ڈاکٹر، دیکھو تو قالین پر یہ خون کا دھبّہ ہے نا؟"

ڈاکٹر صاحب نے جیب سے عینک کا خانہ نکالا۔ خانہ میں سے عینک نکالی پھر جیب میں سے رومال نکالا۔ رومال سے عینک کے دونو شیشے صاف کیے۔ اس کے بعد ناک کی نوک پر عینک کی کمانی رکھ کر قالین کی طرف متوجہ ہوئے۔

"دھبّہ تو ضرور ہے کچھ سُرخی مائل بھی۔ خون ہی ہوگا۔ ممکن ہے خون ہی ہو۔ معلوم تو خون ہی ہوتا ہے ـــــ خون ہے، ضرور خون ہے ـــــ سُنا تم نے داروغہ۔ یار ہماری چھاؤنی سے بھی فوج جانے والی ہے اور جو کہیں ہم کو بھی حکم مل گیا تو ہوگی بڑی کوفت اور بے لطفی۔"

"اچھا فرض کرو" داروغہ جی نے جمعدار کو مخاطب کر کے کہا "فرض کرو یہ خون ہے تو پھر گویا یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتول کو دو طرح قتل کیا گیا۔ پہلے چھری یا کسی آلہ دھاردار سے اور پھر دھگنی پھانسی جوتے کے تسموں سے۔ یا یوں ہوا کہ پہلے پھانسی دی، پھر چھری بھونک دی —— اور نہیں تو پھر یا خون کا دھبہ غلط یا جوتے کے تسموں والی بات!" اس طرح داروغہ جی نے گویا اپنی قطعی رائے ظاہر فرمائی۔

"اور اگر دونوں باتیں غلط نہ ہوئیں، نہ تسمے، نہ پھانسی، پھر —— ارے یار چل بھی یہاں سے بس ہو گئی تفتیش کامل —— سنتے ہیں کہ گاندھی جی نے اپنے آشرم کا سارا گھروندا توڑ ڈالا ارے یار، یہ تو کچھ عجب آدمی ہے —— گاندھی —— بھئی واہ!"

"اوہ! بہکے جاتے ہو" داروغہ جی جھنجلا گئے "—— معاملہ کو الجھاؤ مت، سلجھاؤ تفتیش کا یہی بنیادی اصول ہے۔"

اپنی اخبار بینی کی داد داروغہ جی سے نہ پا کر ڈاکٹر صاحب نے عینک اتار کر اس کے خانہ میں رکھ لی اور خانہ جیب میں۔ اور یہ فرماتے ہوئے چل دیئے۔

"اچھا یار شام کو آئیں گے۔ لاش کا پتہ چل جائے تو ہمیں بلا لیجیو۔"

"اس صندوقچی کو دیکھو۔ اس میں کیا ہے؟ —— گھڑی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۲ روپے ایک انگشتری —— لو تو بس (جمعدار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا) یہ الجھاؤ تو سلجھ گیا۔ قتل کی غرض چوری نہ تھی۔ مال موجود ہے۔ اب اگر قتل کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو دشمنی!"

داروغہ جی نے خالص منطقی استدلال فرمایا "یہ بات تو صاف ہے سمجھے جمعدار!"

جمعدار نے سر ہلا کر اثبات کا اشارہ کیا —— وہ اکثر اثبات ہی کا اشارہ کرنے کے عادی تھے!!

"اچھا جی! اپنے کی باتیں تو سب معلوم ہو گئیں۔ اب ذرا دماغ پر زور دو۔ قاتل کون ہو سکتا ہے؟" داروغہ جی نے اب دوسرا نکتہ حل فرمانے کی کوشش شروع کی جمعدار صاحب نے اپنی عقل کے پانسے پھینکنے شروع کئے :-

"سرکار! مقتول کا کوئی دشمن ہی یقیناً اس کا قاتل ہے۔" جمعدار صاحب نے گویا یہ ایک بالکل نئی بات ڈھونڈھ نکالی! پھر انہوں نے دشمنوں کی فہرست پیش کی :-

"منولال بنئے سے بہت مقدمہ بازی ہو رہی تھی میں نے سنا ہے کہ اپنے نوکر کو بھی —— وہی جواب حوالات میں ہے۔ بہت مارا پیٹا کرتے تھے —— کہتے ہیں کہ بیوی سے بھی ان بن رہتی تھی۔ یونہی طوائف کے معاملہ میں خان بہادر صاحب سے بھی لاگ ڈانٹ تھی —— اب خدا ہی جانے سرکار، ان میں سے کس نے یہ کارروائی کی!" جمعدار صاحب گویا امکانات کے پورے میدان پر پھیل گئے!

"اونہہ ——" داروغہ جی کے دل کو بات نہ جچی —— "تم تو جمعدار بے پر کی اُڑانے لگے۔ ارے میاں تُک بندی سے کیا فائدہ، قدم قدم بڑھنا چاہیئے۔ قاتل کا پتہ لگانے سے پہلے پتہ لگانے کے صحیح طریقہ کا پتہ لگانا چاہیئے۔ یعنی یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ پتہ کس ذریعے سے لگ سکتا ہے۔ ملازم کو تو میں نے بند کر ہی دیا —— سالا پچاس جوتوں میں سب کھول دے گا —— اور دو چار کو اور بند کر دوں —— بس ان سب کا عرق نچوڑ لیجیو —— یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی —— ہلکی آنچ پر تفتیش کی ہانڈی پکا دے —— ہاں جمعدار!" ——

"بجا ہے سرکار! پھر آپ کا تجربہ اور آپ کی عقل ہم جاہلوں، اور گنواروں کے پاس کہاں ؟"

بارہ دن گذر گئے، مقتول کی لاش کا پتہ نہیں، قاتل بھی لاپتہ ہے تفتیش جاری ہے اور داروغہ نے مسل مرتب کر لی ہے۔ شہادتیں تیار ہیں۔ ثبوت کے گواہ بھی تجویز ہو گئے ہیں مجسٹریٹ سے گرفتاری کا وارنٹ مانگا جانے والا ہے۔ ہر چیز تیار ہے۔ در حقیقت سارا مقدمہ اور چالان تیار ہے صرف خفیف سی کمی یہ رہ گئی ہے کہ ابھی قاتل کا پتہ نہیں چلا! اور اس کے علاوہ غیر اہم سہی۔ لیکن ایک کمی یہ بھی ہے کہ مقتول کی لاش کا پتہ نہیں مشتبہ اشخاص کئی ہیں۔ بحث صرف یہ ہے کہ کس کے اور کتنوں کے خلاف وارنٹ جاری کرایا جائے۔ رات کو داروغہ جی کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹے ہیں۔ سامنے ایک مونڈھے پر تھانہ کے "منشی جی" اور جمعدار بیٹھے ہیں۔ تینوں کے بیچ میں ــــ اس تثلیث کا مرکزی نقطہ ــــ ایک حقہ رکھا ہوا ہے۔ گفتگو بہت رازدارانہ ہے۔

"ابی ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ وارنٹ ہو جائے۔ کسی کے خلاف ہی ہو۔ مقدمہ تو عدالت میں آجائے۔ ثبوت تو تیار ہو ہی جائیگا۔ اور اس میں آسانی بھی بڑی ہے جو کوئی اپنے کو بے گناہ کہیگا۔ وہ عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کر دے گا ــــ ــــ کر دے ثابت ــــ ہم تین ملزم پیش کریں گے۔ ایک اگر بری ہوگا۔ تو دو رہ جائیں گے، دو اگر بری ہو گئے۔ تب بھی ایک تو رہیگا!"

"اور اگر تینوں عدالت سے بری ہو گئے ؟" منشی جی نے لقمہ دیا۔ عدالتی کارروائیوں کے متعلق داروغہ جی کے مشیرِ خاص منشی جی تھے۔

"منشی جی! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ تین ملزموں میں سے ایک بھی مجرم ثابت نہ ہو سکے گا؟"

دس دن اور گذر گئے۔ داروغہ جی نے تین ملزموں کے گرفتاری کے وارنٹ حاصل کر لئے۔ سب سے پہلے پولیس کی جماعت موہنی طوائف کے گھر وارنٹ کی تعمیل کرنے پہنچی۔

"ارے کواڑ کھولو! کہاں ہے موہنی ؟ کیا کہا نہیں ہے ؟ یہاں نہیں ہے، تو کہاں ہے ؟ چھپ کر کہاں جائیگی، حرامزادی بمبئی گئی ہے، یہ نہ کہدیا حج کرنے گئی ہے بتاؤ سالو! کہاں ہے ملزمہ، ہم سے بچکر کہاں جائے گی سسری! یہ پولیس ہے پولیس ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے، ابھی حاضر کرو ملزمہ کو ــــ نہیں تو ــــ"

"سرکار! وہ تو قسم خدا کی بیس پچیس روز سے یہاں نہیں ہیں، بمبئی گئی ہوئی ہیں۔"

"بمبئی کی ایسی تیسی، سچ بتاؤ کہاں چھپایا ہے ــــ بول نہ بتائے گی یہ حرامزادی چوٹی پکڑ کر لگاؤ تو ایک چانٹا، ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں، مجھے بھی کوئی تماشبین سمجھا ہے نانگہ جی! میں تھانہ دار ہوں تھانہ دار، لینا جمعدار ذرا بڑھیا ڈھڈو کی خبر!"

داروغہ جی بید کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لئے سگریٹ منہ میں دبائے ٹہل رہے ہیں۔

"جیسی چاہو قسم لے لو داروغہ جی! موہنی یہاں نہیں ہے، ہاں کل آنے والی ہے۔ وُہ بمبئی سے آج چلی ہو گی۔ ہزار گواہ پیش کر دوں گی۔ اُس کو گئے بیس پچیس دن ہو گئے، کیوں اُستاد جی کہتے نہیں ہو، تم ہی تو اُس کو پہنچانے اسٹیشن پر گئے تھے —— اور داروغہ جی آپ سے کیا پردہ ہے۔ آپ جا کر پوچھ نہ لیجئے، وُہ تو خانصاحب کے ساتھ گئی ہے۔"

"کون خانصاحب، بتا حرامزادی کون خانصاحب، ہم نہیں جانتے، کون خانصاحب، ملزمہ کو حاضر کر!"

"اے وہی خانصاحب، داروغہ میاں، انہیں کون نہیں جانتا؟ وہی نا پتو کھیڑہ کے زمیندار خدادادخاں —— کیوں استاد جی، تم نے تو دونو کو ریل میں سوار ہی کرایا تھا!"

اُس شب کو داروغہ جی نے اپنے روزنامچہ میں کیا کھپایا اور منشی جی نے کیا لکھا —— ہمیں معلوم نہیں۔ تفتیش بہرحال نامکمل ہی رہی!

سزائے موت

بادشاہ خود مختار مگر نرم دل تھا۔ انصاف اور عدل کے اصول مستحکم مگر سختگیر نہ تھے سخت سے سخت شاہی احکام میں رحم کی گنجائش اور لچک باقی رہتی تھی۔

اس ملک میں کبھی کسی نے سزائے موت کا نام بھی نہ سُنا تھا۔ نہ کبھی کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ قانونی سزاؤں میں انتہائی سزا جلاوطنی کی تھی۔ وہ بھی شاذونادر، دس بیس برس میں کسی ایک مجرم کو، ایک دفعہ، لیکن اس انتہائی سزا میں بھی رعایت اور رحم کی لچک باقی رہتی تھی۔ فرض کیجئے کہ بادشاہ نے زید کو مُلک بدر کر دیا۔ زید وطن سے دُور کیونکر رہ سکتا تھا۔ وہ کچھ روز وطن کی سرحد کے پاس آوارہ گردی کرتا رہا، پھر کچھ روز بعد کبھی کبھی سرحد کے اندر بھی آنے لگا۔ دو چار فرلانگ سلطنت کی حدود کے اندر

چلا پھرا اور پھر واپس ہو گیا، پولیس کا بھی کچھ خوف تھا۔ چوکیداروں کا بھی کچھ اندیشہ تھا (فوج اس ملک میں نام کو نہ تھی۔ فوج کی ضرورت ہی نہ تھی! چوکیدار اور پولیس کے سپاہی قانون کے محافظ تھے اور بس!) کچھ روز آوارہ گردی کے بعد زید کو کسی نے نہ ٹوکا تو وہ دارالسلطنت کے اندر بھی آنے جانے لگا کبھی کسی قہوہ خانہ میں جا بیٹھا، کبھی باغِ عامہ میں چہل قدمی کی —— کون جانے کون ہے، مگر ایک دن باغِ عامہ کے دروازے پر پولیس کے افسر نے پہچان لیا۔ راستہ روک کر اس نے کہا:

"جنابِ من! آپ تو شاید ملک بدر کیے جا چکے ہیں؟" ——

"جی ہاں! مگر میں صبح ہی تو آیا تھا اور شام کو ضرور چلا جاؤں گا۔"

"ہاں! یہ صورت ہے —— تو کچھ حرج نہیں!"

عمر بھر زید یوں ہی پولیس والوں سے صبح کا آنا اور شام کا جانا بیان کرتا رہا۔ جلاوطنی کا حکم بھی اس کے خلاف قائم اور حکمِ شاہی کا احترام بھی برقرار رہا، مگر زید کی آزادی میں بھی کوئی مداخلت نہ ہو سکی!

مگر ایک دفعہ بادشاہ کے ملک میں ایک سخت حادثہ پیش آیا! ایک بہت ہی سخت حادثہ، جیسا کہ کبھی پہلے پیش نہ آیا تھا، یعنی بادشاہ کی رعایا میں سے ایک نے اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ ایسا واقعہ اس ملک کے باشندوں نے کبھی پہلے نہ دیکھا نہ سنا تھا، عدالت میں ہزارہا اشخاص کا مجمع تھا، ملزم کے خلاف عام طور پر

نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ عدالت کے جج صاحبان سخت غصے اور رنج کی حالت میں مقدمہ کی سماعت کے لئے اپنی کرسیوں پر آبیٹھے۔ بادشاہ بھی اس حادثے کی وجہ سے بہت مغموم تھا۔ ججوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ خون کا بدلہ خون ہونا چاہیئے۔ نہ ایسا جرم کبھی کسی نے پہلے سُنا تھا نہ ایسی سزا! لوگ حیران بھی تھے، ناراض بھی تھے مغموم بھی تھے!

پولیس نے ملزم کو اپنی حراست میں لے لیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کو قتل کس طرح کیا جائے۔ سلطنت کے طول و عرض میں نہ کوئی جلاد تھا۔ نہ کسی کو پھانسی دینا آتی تھی۔ بہت سے طویل مشوروں کے بعد وزرائے شاہی نے ہمسایہ سلطنت کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ پھانسی دینے کا سامان اور ایک پھانسی دینے والا بھیج دیا جائے، بہت سی خط و کتابت کے بعد ہمسایہ سلطنت نے آمادگی ظاہر تو کی مگر اس شرط پر کہ اس خدمت کے معاوضہ میں ایک ہزار سکے دئے جائیں جب اُس کا یہ جواب وصول ہوا تو بادشاہ اور اس کے وزراء کو عرصہ تک اس سوال پر غور کرنا پڑا۔ لیکن کسی طرح معاوضہ دیکر مجرم کو قتل کرانے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ وُہ کہتے تھے کہ ایک انسان کی جان جسم سے نکالنے کے لئے ایک ہزار سکوں کا خرچ کر دینا محض حماقت ہے۔ آخر کار ہمسایہ سلطنت سے امداد لینے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

چھ مہینے گذرے لیکن واجب القتل مجرم ابھی زندہ ہے!

پھر ایک دفعہ مجلسِ وزراء نے اس مسئلہ پر غور کیا اور پھر ایک دفعہ کسی دُوسری

سلطنت کو لکھا گیا کہ وُہ پھانسی دینے کا سامان بھیج دے۔ وہاں سے بھی ہزار تو نہیں مگر پانچسو سکّوں کا مطالبہ کیا گیا۔ بادشاہ کے کابینہ نے پھر راتوں اور دنوں اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنے دماغوں پر زور ڈالا۔ آخر کار وہی فیصلہ ہوا جو پہلے ہو چکا تھا" پانچ سو روپیہ، محض ایک مجرم کا گلا دبا کر اس کی جان نکالنے کے لئے؟ کیا حماقت ہے، نہیں ہو سکتا، جب شہر میں کابینہ کے اس فیصلہ کی خبر پہنچی تو وہاں بھی چھوٹے بڑے نے یہی کہا کہ" یہ نہیں ہو سکتا!"

پھر کیا ہو؟ کم و بیش ایک سال تک مجلسِ وزراء کے جلسوں میں اس سوال پر بحث ہوتی رہی۔

اور مجرم ہنوز زندہ رہنے پر مجبور تھا!

دو سال گذر گئے، بادشاہ اور وزراء کا ناخنِ عقل اس گرہ کو نہ کھول سکا، بالآخر حکم ہوا کہ پولیس کا ایک سپاہی تلوار سے مجرم کی گردن کاٹ دے، بڑی بات یہ تھی کہ اس صورت میں سلطنت بہت سے ناواجب اخراجات سے بچ جائے گی۔ چنانچہ پولیس کے افسر کو حکم دیا گیا کہ ایک سپاہی کو اس غیر معمولی کام کے لئے نامزد کر دے مگر افسر نے عذر کیا کہ اس کے سپاہیوں کو اس طرح تلوار استعمال کرنے کی بالکل عادت نہیں! افسر کا جواب ناقابلِ اعتراض تھا۔

اب کیا کیا جائے؟ ہفتوں مجلسِ وزراء کے جلسے صبح و شام ہوتے رہے۔ مگر اس سوال کا جواب میسّر نہ آتا تھا! اور مجرم ہنوز نہ زندگی کی امیدوں سے دور

نہ موت سے قریب تھا!

ایک دن اُن وزراء میں سے ایک نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "کیوں نہ ہم سزائے موت کو حبسِ دوام سے بدل دیں" تمام اراکینِ مجلس اس تجویز کی معقولیت کے معترف ہوئے اور بادشاہ نے بھی اُس کو مناسب اور بہتر تجویز سمجھکر منظوری دے دی مگر یہ تجویز بھی دشواریوں سے خالی نہ تھی۔

مجرم حبسِ دوام کی سزا کو پسند بھی کرے گا یا نہیں؟

جیل خانہ کہاں ہے جس میں وُہ عمر بھر رکھا جائے؟

اور جیلر کا کیا انتظام ہوگا؟

اور مجرم کو زندہ رکھنے کے لئے خورد و نوش کا خرچ کون برداشت کریگا؟

سلطنت کو آج تک جیل خانے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ لہٰذا سرکاری جیل خانہ موجود نہ تھا، نہ جیلر تھا، پھر ہفتوں مشورے ہوئے اور بالآخر ایک مکان کرایہ پر لے کر جیل خانہ بنایا گیا۔ ایک شخص کو نوکر رکھا گیا کہ وُہ جیلر بن کر قیدی کی حفاظت کیا کرے۔ شاہی باورچی خانے سے قیدی کے کھانے کا انتظام منظور ہوا۔ کہہ سنکر قیدی کو بھی راضی کر لیا گیا کہ وُہ اپنی سزا کی نوعیت بدل جانے پر نارضامندی کا اظہار نہ کرے، دو تین سال کی کشمکش کے بعد اب قیدی اپنے جیل خانے میں آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے!

چھ مہینے تک یہ دستور رہا کہ قیدی اپنے گھاس کے بستر پر لیٹا رہتا تھا۔ جیلر صبح آتا تھا اور دروازے پر ایک کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ شام تک یا تو قیدی سے باتیں کرتا رہتا تھا یا شطرنج کھیلتا رہتا تھا، دونوں وقت شاہی باورچی خانے کا ایک غلام، قیدی اور جیلر کا کھانا پہنچا دیا کرتا تھا۔ شام کو جیلر مکان کا دروازہ باہر سے بند کر کے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اب حکامِ اعلیٰ کو اس قیدی کے متعلق کوئی تردد باقی نہ رہا ہوگا مگر بادشاہ خود ابھی تک متردّد تھا، وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ملک کے بجٹ پر اس مستقل خرچ کا بار کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے، قیدی ابھی نوجوان ہے، سالہا سال زندہ رہے گا۔ پھر یہ مکان کا کرایہ، جیلر کی تنخواہ، قیدی کا کھانا، یہ تو گویا ساری عمر کا خرچ پیچھے لگ گیا اور اس میں شک نہیں کہ بادشاہ کا تردد کچھ بے جا نہ تھا۔ چنانچہ پھر ایک دن مجلسِ وزراء نے بادشاہ کے اس سوال پر غور کرنا شروع کیا، مہینوں کے بعد شاہی کونسل بالآخر اس فیصلہ پر پہنچی کہ اگر قیدی اپنی حفاظت خود کرنے پر آمادہ کیا جا سکے تو جیلر کو برخاست کر دیا جائے، اس کی تنخواہ کے بقدر اخراجات میں تخفیف ہو جائے گی۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ قیدی کوئی ضدّی آدمی نہ تھا۔ اُس نے اپنی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی اور اب وہ تنہا اپنے جیل خانے میں صبح سے شام تک زندگی بسر کرتا تھا۔ دن میں دو دفعہ جب شاہی باورچی اس کا کھانا لے کر آتا تھا تو ایک دو گھنٹہ شطرنج کی کوئی بازی اس کے ساتھ کھیل جاتا

تھا۔ کچھ عرصے تک قیدی کی زندگی کا یہ راستہ بالکل ہموار رہا۔ لیکن ایک دن شاہی باورچی بھول گیا، یا مصروف زیادہ تھا، یا بیمار ہو گیا، غرضیکہ قیدی کا کھانا وقت پر نہ آ سکا۔ بھوک نے شاہی قوانین کی پابندی سے انکار کر دیا۔ اور قیدی خود ہی قید خانے سے نکل کر شاہی باورچی خانے تک پہنچ گیا۔ جب ایک دفعہ قیدی اپنا کھانا لینے خود جا سکتا تھا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہر دفعہ وہی نہ جایا کرے۔ مجلسِ وزراء نے بھی مزید کفایت کے اس پہلو کو پسند کیا اور اب یہ دستور ہو گیا کہ قیدی دونوں وقت خود ہی اپنا کھانا لے آتا تھا اور رات کو قید خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہتا تھا۔ کھانا لانے اور شاہی باورچی خانے تک جانے آنے کے سلسلہ میں کبھی باغِ عامہ میں دو چار گھنٹے سیر و تفریح، یا کبھی کسی قہوہ خانے میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا وقفہ ایک ایسی معمولی بات تھی جس کے متعلق قیدی سے نہ کبھی باز پرس ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی! وہ خود ہی اتنا ایماندار اور قانونِ سلطنت کا پابند تھا کہ دن بھر باہر رہنے کے بعد بھی شب کو کبھی اپنے جیل خانے سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا۔ اس طرح کئی سال گذر گئے۔ قیدی اپنی سزا بھگت رہا تھا اور حکومت کا ضمیر بھی مطمئن تھا کہ خطا وار کو کافی سزا دے کر قانون کی عزت برقرار رکھی گئی!

لیکن بادشاہ ہر سال اپنے بجٹ میں جیل خانے کے اخراجات کی مد کو دیکھکر بہت متردّد ہوتے تھے۔ اُن کی رائے میں جیل خانہ کا کرایہ اور قیدی کی

خوراک کا خرچ ملک کے بجٹ پر ایک بے جا بار تھا۔ رفتہ رفتہ ایک دن پھر اخراجات کا یہ سوال مجلسِ وزراء کے سامنے آ گیا۔ کسی نے یہ تجویز پیش کی، قیدی کی سزا کو حبسِ دوام کی بجائے جلاوطنی کر دیا جائے اور اس طرح جیل خانے کے اخراجات سے ملک کو بچانا چاہیے۔ تجویز معقول تھی، اُس پر مجلس متفق ہو گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ قیدی بھی سزا کی اس ترمیم پر راضی کیا جا سکے گا؟ مجلس کے روبرو قیدی حاضر کیا گیا اور اس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی ——— اپنی طویل مدتِ قید میں جب وُہ تمام احکام کو اطاعت اور بندگی کے ساتھ قبول کرتا رہا۔ پہلی دفعہ قیدی نے وزراء کی اس تجویز پہ سخت اعتراض کیا اُس نے کہا:۔

"جناب آپ نے قتل کا حکم دیا، میں نے عذر نہ کیا۔ آپ نے حبسِ دوام کا حکم دیا۔ میں اس پر بھی رضامند ہو گیا۔ آپ نے میرے جیلر کو موقوف کر دیا۔ میں نے شکایت نہیں کی۔ آپ نے میری حفاظت کا فرض مجھ ہی پر عاید کر دیا۔ میں نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ پھر آپ نے مجھی کو مجبور کیا کہ باورچی خانے سے اپنا کھانا لایا کروں، یہ بھی میں نے آپ کی خاطر منظور کیا۔ اب آپ مجھے ملک سے نکالتے ہیں، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کھاؤں گا کیا۔ میری وجہ معاش کیا ہو گی، میں آپ کا قیدی

ہوں۔ آپ نے مجھے قید کیا اور میں نے آپ کے تمام احکام کی تعمیل کی، لہٰذا اب میری پرورش آپ کے ذمّہ نہیں تو کس کے ذمّے ہے؟"

قیدی نے جس قدر عذر پیش کئے۔ سب معقول تھے! شاہی کونسل لاجواب ہو گئی۔ جلسہ برخاست ہو گیا اور شاہی محل کے بڑے کمرے میں کچھ عرصے تک اس سوال پر مشورے ہوتے رہے کہ ہو تو کیا ہو، کریں تو کیا کریں۔ قیدی جلاوطنی پر راضی نہیں ہوتا۔ قتل کیا نہیں جا سکتا، حبس دوام کے اخراجات بہت ہیں پھر سمجھوتہ کیونکر ہو؟ اس وقت تک قیدی کے اخراجات کا اوسط ایک ہزار روپیہ سال کے قریب تھا۔ اگر یہ رقم نہیں بچائی جا سکتی تو نصف ہی بچا لی جائے۔ اس طرح کہ قیدی کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ پانچسو روپیہ سال لے لیا کرے اور اس ملک سے چلا جائے۔ جب اس تجویز میں بادشاہ اور اس کے وزراء متفق ہو گئے تو پھر قیدی کو کونسل کے سامنے طلب کیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ ــــ

"تم کو پانچسو روپیہ سال پنشن ملیگی۔ بشرطیکہ تم اس ملک سے چلے جاؤ۔"

گو قیدی اس تجویز کو انصاف اور قانون کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن لوگوں کے سمجھانے سے وہ بالآخر اس پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ وہ اب سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے باغ میں رہتا ہے۔ ہر تیسرے مہینے بادشاہ کا ہرکارہ اس کی پنشن اس کو دے جاتا ہے۔ اس طرح اس کے حبسِ دوام کی طویل مدت گذر

رہی ہے!!

جو تکلیفیں اور پریشانیاں اس قیدی کے متعلق وزرائے سلطنت کو ہوئیں اس کا لحاظ کر کے ملک کے قانون میں اب اس قدر ترمیم کر دی گئی ہے کہ آئندہ مجرموں کو سزا کے بعد جیل خانے میں رکھنے کی بجائے پنشن دے کر ملک بدر کر دیا جاتا ہے اور وُہ ہمسایہ ممالک میں سرکاری پنشن پر اپنی سزا کا زمانہ بسر کر لیتے ہیں!

گھوڑا

برہما دیوتا کو دُنیا کے لئے جو کچھ پیدا کرنا تھا۔ قریب قریب سب ہی پیدا کر چکا۔ اب وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ شاید اس فکر میں تھا کہ کوئی نئی چیز، کوئی عجیب تر مخلوق اپنے کائنات آفریں دماغ سے نکال کر عالم امکان میں لائے —— دفعتہً اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا —— اسے کوئی نئی بات سُوجھی، اُس کی قوتِ تخلیق نے کوئی نیا تخیّل پیدا کیا!

دیوتا نے اپنے کارخانۂ قدرت کے مہتمم کو طلب کیا۔ "پانچوں عناصر لاؤ بہت سے، ہم ایک نئی چیز پیدا کرنے والے ہیں۔"

ہنستم نے ہاتھ باندھکر عرض کیا! اے خالق، اے کرتار جب تونے تخلیق کے جذبۂ بے اختیار کے ساتھ اپنے کارخانے کا سارا سامان بیدریغ خرچ کرڈالا اور ہاتھی، اونٹ، شیر، ریچھ جیسے کثیر الجثہ اور قوی الجسم جانور پیدا کرڈالے تو اے داتا تونے اپنے ذخائر پر ذرا بھی نظر نہ کی۔ اب تو مخلوق کے جسم میں طاقت اور حرارت پیدا کرنے والے تمام عناصر ختم ہوچکے۔ خاک، پانی، آگ بہت قلیل مقدار میں باقی ہیں۔ ہاں ہوا اور آکاش جتنا چاہئے موجود ہے۔"

چار سر والا دیوتا سوچنے لگا۔ اپنی چاروں مونچھوں پر وُہ بار بار ہاتھ پھیرتا تھا۔ آخر اُس نے کہا! جا جو کچھ باقی ہے۔ وہی لے آ۔ میرا جدّت طراز تخیل ذخائر کی کمی کو پورا کرے گا —— جا!"

عناصر کی قلت نے برہما کو کفایت شعاری پر آمادہ کیا۔ اُس نے خاک پانی اور آگ کو بہت کم مقدار میں صرف کیا۔ ہوا اور آکاش زیادہ صرف کی۔ اس طرح ایک نئے جانور کا پُتلا تیار ہو گیا۔ ذخائر کی کمی کے باعث اس کو نوکدار پنجے اور سینگ نہیں دیئے گئے۔ دانت ایسے دیئے گئے کہ سوائے چبانے کے کوئی دوسرا کام نہ کرسکیں، پھر اس کے خمیر میں آگ نہ اتنی زیادہ ڈالی گئی کہ وُہ جنگجو ہو جائے نہ اتنی کم کہ بزدل ہو جائے —— اس طرح برہما نے اپنے تخیل کو جامۂ ہستی پہنایا —— یہ جانور گھوڑا بنا!

جب اس کو زمین پر کھڑا کیا گیا تو وُہ ایک لمحہ بھی بے حرکت نہ رہ سکتا تھا۔ اکاس اور ایتھر اس کو بے چین رکھتا تھا! وُہ ہوا سے آگے جانا چاہتا تھا، زمین کی ساری وسعت کو اپنے ایک قدم کے برابر نہ سمجھتا تھا! دوسرے جانور کوئی ضرورت یا سبب ہو تو دوڑتے ہیں مگر یہ بے ضرورت دوڑنے لگا، گویا اپنی کھال سے باہر نکل جائیگا، وُہ نہ کسی کا تعاقب کرتا ہے، نہ کسی کو مارنا پکڑنا چاہتا ہے۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ بھاگا چلا جائے۔ تا آنکہ حدِ نظر پر اُس کا وجود ایک نقطۂ موہوم ہو جائے! اس کا عکس وہم و خیال ہو کر رہ جائے اور وُہ خلائے بسیط میں گم ہو جائے!!

چار سر والا برہما اپنی اس نئی مخلوق کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی تمام مخلوق کو مسکن دیئے۔ کسی کو جنگل، کسی کو دریا، کسی کو پہاڑوں کے غار لیکن گھوڑے سے وُہ اس قدر خوش تھا کہ اُس نے اپنی اس جدید مخلوق کو اپنی نظروں کے سامنے ایک سبزہ زار عطا کیا کہ وہاں وُہ اپنی تیز رفتاری کے مزے لوٹا کرے! مگر . . . اس سبزہ زار کے پاس ہی انسان کا مسکن تھا!

انسان کی فطرت کے لئے وجہ طمانیت لُوٹ مار اور قتل و غارت ہے۔ یہ لٹیرا اس قدر لوٹتا ہے کہ اس کے مال و اسباب کا بوجھ اس کی گردن پر ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس کی دولت اس کی کمر کو زخمی کر دیتی ہے پس جب

اس نے گھوڑے کو دیکھا کہ وُہ ہوا کا تعاقب کرتا ہے اور آسمان کو ٹھکراتا ہے۔ تب اُس نے اپنے جی میں کہا:۔

"اگر یہ گھوڑا میرے قبضہ میں آجائے تو میں اسکی کمر پر اپنا بوجھ رکھا کروں گا ——— آہا! میں کیسا ہلکا ہو جاؤں گا!" ——— اُس نے ایک دن گھوڑے کو پکڑ لیا۔

پھر اُس نے گھوڑے کی پشت پر زین کس دی اور اس کے مُنہ میں ایک خاردار زنجیر لگا دی۔ اُس نے تازیانہ اور مہمیز بنائے تا کہ وُہ گھوڑے کو سمجھا سکے کہ اپنی مرضی کے مطابق اور اُس کی مرضی کے خلاف چلنا کتنا بڑا گناہ ہے!

گھوڑے کے گرد اُونچی دیواریں بنا دی گئیں تا کہ وُہ بھاگ نہ جائے۔ اُس کے پاؤں میں رسیاں باندھ دی گئیں۔

شیر کا مسکن جنگل تھا۔ وُہ بدستور اپنے جنگل میں رہا۔ چیتے کا مسکن پہاڑوں کے غار تھے۔ وُہ بدستور غاروں میں رہا۔ مچھلیوں کا وطن دریا تھا۔ وہ دریا میں رہیں۔ لیکن گھوڑے کا گھر کھلا ہوا سبزہ زار تھا: اس لئے وُہ اصطبل میں بند کر دیا گیا۔ اس کے خمیر میں اکاس اور ہوا جزو غالب تھی۔ اُس کے دل میں آزادی کی تمنائیں بیتابانہ پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن بالکل اسی لئے (کہ وُہ آزادی کی تمنا رکھتا تھا) اس کے پاؤں میں رسی باندھ دی گئی۔

گھوڑے نے جب دیکھا کہ اس کی گردن میں غلامی کا طوق بہت بھاری

ہے تو اُس نے اصطبل کی دیواروں پر لتّیاں مارنی شروع کیں، لیکن اس عمل سے دیواروں کو تو اس قدر صدمہ نہ پہنچا، جتنا کہ خود گھوڑے کی ٹانگوں اور سموں کو! تاہم دیواروں کا تھوڑا سا چونا ٹوٹ کر گر گیا اور اس کی ظاہری خوبصورتی ضرور کم ہو گئی۔

مگر انسان کو گھوڑے کی یہ حرکتیں بہت ناگوار گذریں۔ جھنجلا کر ایک دن اُس نے کہا! "احسان فراموش جانور! کیا میں اس کو دانہ پانی نہیں دیتا؟ کیا میں اس کا جسم ملنے کے لئے بڑی بڑی تنخواہوں کے ملازم نہیں رکھتا؟ اور اس ناشکر گذار کو دیکھو کہ یہ کسی طرح خوش نہیں!"

ملازموں نے گھوڑے کے خوش کرنے کی ایسی ایسی تدبیریں کیں کہ آخر وہ نہ صرف لتّی مارنا بھول گیا بلکہ اس کی بہت سی فطری طاقتیں بھی سلب ہو گئیں!

ایک دن انسان اپنے بہت سے دوستوں اور پڑوسیوں کو جمع کر کے گھوڑے کے پاس لایا! اُس نے کہا! "دوستو! جیسا میرا گھوڑا وفادار ہے۔ ایسا وفادار جانور تم نے کبھی دیکھا ہے؟"

دوستوں نے کہا! "کبھی نہیں، کبھی نہیں۔ یہ تو ایسا بے حس و حرکت ہے جیسے خندق کا پانی اور ایسا نرم مزاج ہے جیسا تمہارا مذہب!"

یہ تو معلوم ہی ہے کہ جب گھوڑا پیدا کیا گیا تو نہ اُس کے سینگ تھے، نہ تیز

دانت، نہ نوکدار پنجے، پھر جب اس کا دیوار پر پٹکیں مارنا بھی روک دیا گیا، تو اب سوائے آواز کے اس کے پاس اپنے محسوسات کے اظہار کا ذریعہ ہی کیا باقی تھا؟ لیکن اس کی آواز سے، انسان کی نیند خراب ہوتی تھی! پھر بھی یہ خیال تھا۔ اس کی آواز سُنکر ہمسائے کیا کہیں گے، جن کو اسکی وفاداری کا پورا یقین دلایا جا چکا ہے۔ پس انسان نے ایسی تدبیریں کیں کہ گھوڑے کا مُنہ بھی بند ہو گیا ——— مگر جب تک جسم میں جان ہے کچھ آواز تو ضرور نکلے گی (جو لوگ آواز بند کرنا چاہیں۔ ان کو چاہیئے کہ سانس بھی بند کر دیں) چنانچہ گھوڑے کا مُنہ تو بند تھا مگر کراہنے کی آواز کبھی کبھی نکل ہی جاتی تھی۔

ایک دن یہ آواز برہما کے کانوں تک پہنچی! دیوتا اپنے مراقبہ سے چونکا: زمین کی طرف نظر کی تو گھوڑے کو سبزہ زار پر نہ پایا! جھنجلا کر موت کے دیوتا کی طرف پلٹا! یہ سب تمہاری حرکت ہے تم نے میرے گھوڑے کو دُنیا سے اُٹھا لیا" موت نے کہا" میرے دیوتا! سارے عالم کے خالق! تجھے جب بدگمانی ہوتی ہے تو مجھ ہی پر ہوتی ہے! تو اگر ایک نظر انسان کی طرف دیکھے تو تجھے ساری خرابیوں کا حال معلوم ہو جائے!" برہما نے پھر زمین کی طرف دیکھا، اُس نے اصطبل کی چار دیواری دیکھی اور اُس کے اندر سے اپنے گھوڑے کے کراہنے کی آواز سُنی۔ برہما کی پیشانی پر غصہ کی شکن پیدا ہوئی، اُس نے گرج گرج کر کہا! سُن رے انسان! اگر تو میرے گھوڑے کو آزاد نہ کر دے گا تو میں اس کے بازوؤں میں شیر کے پنجے اور اس کے مُنہ میں

چیتے کے دانت پیدا کر دوں گا۔" انسان نے برہما کی آواز سُنی اور کہا؟ اے دیوتا! دُنیا میں خونخواری کو ترقی دینا تیری شان سے بعید ہے۔ اگر مجھے صاف گوئی کی اجازت ہو تو عرض کروں کہ تیرا یہ گھوڑا اس قابل ہی نہیں کہ اس کو آزاد رکھا جائے۔ میں نے تو اسی کے فائدے کے لئے یہ اصطبل بنایا ہے۔ اے دیوتا! دیکھ تو میں نے تیرے گھوڑے کے لئے خوبصورت اور آرام دہ اصطبل بنایا ہے!"

برہما خاموش تھا اور کچھ سوچ رہا تھا!

انسان نے پھر کہا! اے میرے دیوتا! تیری عقل کے سامنے میرا سرِ تسلیم خم ہے۔ لیکن ہفتہ بھر کی مہلت عنایت ہو، اگر ایک ہفتہ گذرنے کے بعد بھی تیری رائے یہی ہو کہ اس جانور کے لئے میرے اصطبل کے مقابلہ میں تیرا سبزہ زار بہتر ہے تو میں تیرے حکم کے آگے سر جھکا دوں گا"!

انسان نے مہلت کا یہ زمانہ ضائع نہیں کیا۔ اُس نے گھوڑے کی دو ٹانگوں میں رسی باندھ کر کھیتوں میں چھوڑ دیا، گھوڑا بُری طرح لنگڑاتا تھا اور جنگل کے چرند پرند اُس کی تمسخر انگیز چال کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ برہما نے اُوپر سے گھوڑے کی اس بدنما چال کو دیکھ کر منہ بنایا ——— اُس نے بدنما رفتار کو تو دیکھا مگر ——— اُس رسی کو نہ دیکھا جو اُس کی ٹانگ میں بندھی ہوئی تھی! دیوتا سوچنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ ایسے گھوڑے کا وجود تو میری صناعی پر حرف لائیگا۔ دوسرے دیوتا

میری اس جدّت پر ہنسیں گے، میں نے یہ کیسی غلطی کی کہ ایسا جانور پیدا کیا . . . .

انسان اس وقت کا منتظر تھا، سمجھ گیا کہ دیوتا کے دل میں کیا ہے۔ اس نے پکارا! "اے میرے دیوتا! دیکھ لیا تو نے اپنے گھوڑے کو؟ تیرا حکم ہو تو میں اسے تیرے آسمانوں کے کسی سبزہ زار میں پہنچا دوں؟"

برہما نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر کہا "نہیں اے انسان! نہیں! لے جا تو اس گھوڑے کو، اپنے اصطبل ہی میں لے جا!"

انسان نے ذرا آواز بلند کر کے کہا "دو جہاں کے داتا! یہ گھوڑا انسانوں کے لئے ایک بارِ گراں ہو جائے گا!"

برہما نے کہا "جا اے انسان! تیرے لئے یہ بھی ایک بارِ امانت ہے، تیری انسانیت کا اقتضا یہ ہونا چاہئے کہ اس بار کو برداشت کرے، جا، گھوڑا اپنے اصطبل میں لے جا اور اس کی حفاظت کر!"

"تیرا حکم! میرے داتا! یہی ہے تو یہی سہی" انسان نے کہا!

ٹیگور کا تخیّل

نتیجہ برائے

یوں تو ہمارے قصبہ کے اسکول میں بہت سے عجیب و غریب ماسٹر صاحبان تھے مگر یہ سچ ہے کہ بڑے ماسٹر صاحب عجیب تر تھے۔ قصبہ کا بچہ بچہ اُن کی خصوصیات سے واقف تھا۔ عمر پچاس اور پچپن کے درمیان، داڑھی کھچڑی اور اُس کے بال اُلجھے ہوئے اُلجھے ہوئے اِس لئے کہ اُن کے سلجھانے کی طرف کبھی "بڑے ماسٹر صاحب" کافی توجہ کر ہی نہ سکتے تھے۔ وجہ یہ کہ بازار میں کنگھیوں کی قیمت بہت زیادہ تھی —— تین چار حتّیٰ کہ پانچ پیسے! —— کوئی کم بخت دوکاندار اس سے کم قیمت پر کنگھی فروخت نہ کرتا تھا۔ اس عام گرانی کے باعث بڑے ماسٹر صاحب نے بازار جانا ہی ترک کر دیا تھا۔ وہ ایک سیاہ سوتی اچکن پہنا کرتے تھے اور سیاہ سوتی پگڑی ان کے سر پہ

ہوتی تھی۔ ہر موسم میں ان کی وہی اچکن اور وہی پگڑی استعمال ہوتی رہتی تھی۔ اور اگر قصبہ کے تمام باشندوں سے حلفی بیان لیا جائے تو ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ملے گا جو یہ کہہ سکے کہ اس نے کبھی ماسٹر صاحب کو اسی اچکن اور اسی پگڑی کے بغیر دیکھا ہے۔ ایک تیسری چیز جو ان کے سیاہ لباس کا ——— لباس کا نہیں بلکہ جسم کا جزو لازمی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی چھتری تھی۔ جو ایک غلاف میں ملفوف رہا کرتی تھی۔ چوتھی ضروری چیز ان کی عینک تھی۔ وہ بھی ایک سیاہ خانہ میں بند رہتی تھی اور صرف سبق کے وقت اپنے خانہ سے نکل کر ان کی ناک کی نوک پر کچھ دیر رکھی رہتی تھی۔ اور پھر سکول کا آخری گھنٹہ بجتے ہی اپنے خانہ کے اندر ملفوف ہو جاتی تھی۔ پانچویں اہم شے جس کا تعلق بڑے ماسٹر صاحب کے وجودِ فانی سے تھا۔ ایک موٹی اور بھاری گھڑی تھی، جو ایک سیاہ چمڑے یا کرمچ کے غلاف میں محفوظ رہتی تھی، اور ماسٹر صاحب صرف دو ہی دفعہ اس کو اپنی جیب اور پھر اس کے غلاف سے نکالا کرتے تھے سبق شروع کرتے وقت اور سبق ختم کرتے وقت!

ماسٹر صاحب کا بشرہ بھی کچھ ایسا تھا کہ گویا اس پر ایک غلاف چڑھا ہوا ہے غصہ رنج، خوشی اس قسم کی کیفیات عمر بھر اُن کے چہرہ سے نا آشنا رہیں ہنستے ہوئے اُن کو کبھی کسی شخص نے نہ دیکھا نہ روتے ہوئے۔ نہ غصہ کی حالت میں اور حقیقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کی روح پر بھی کوئی سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہو گا!

آواز ان کی بہت دھیمی اور گفتگو کا لہجہ نہایت نرم تھا، مگر بات وہ صرف اتنی

ہی کرتے تھے جتنی کہ بالکل ناگزیر ہو۔ بہت سے مطالب وہ محض اشاروں ہی سے ادا کر دیتے تھے۔ مثلاً اگر کلاس میں سبق پڑھانے پڑھانے ان کو پیاس لگی۔ تو وہ کبھی یہ نہ کہتے تھے کہ "پانی لا۔ مجھے پیاس لگی ہے۔" بلکہ اپنے مخصوص اشاروں اور مخففات سے کام لیتے تھے یعنی آہستہ سے "لاؤ" کہا اور ہاتھ کی انگلیوں سے پیالے کی شکل بنا کر دکھا دی۔ استاد کے ان رموز سے شاگرد اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اس لئے کبھی مفہوم کے اظہار میں کوئی خرابی واقعہ نہ ہوتی تھی۔ ماسٹر صاحب کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ اس لئے اشارات کا سلسلہ بھی کچھ زیادہ وسیع نہ ہو سکتا تھا۔ پان، سگرٹ حقہ، شربت، سوڈا لیمینیڈ، اس قسم کی تمام فضولیات سے وہ سخت پرہیز کیا کرتے تھے۔ ان کی غذا بہت سادہ اور مختصر ہوتی تھی۔ صبح کو چار پیسے کا آٹا لاتے تھے اُس کی دو موٹی موٹی روٹیاں خود ہی پکا لیتے تھے اور آٹھ آنے کی شکر میں سے جو وہ ہر مہینے کے شروع میں لایا کرتے تھے۔ ایک دو چٹکی پانی کے ایک آبخورہ میں ڈالکر شربت بنا لیتے تھے۔ اس شربت میں وہ ایک روٹی صبح اور ایک شام کو بھگو کر کھا لیتے تھے!!

اس کے علاوہ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے مدرسہ آتے یا جاتے کسی خوانچہ والے سے دو یا تین سفریاں یا شریفے یا کھٹے آم بھی خریدے۔ لیکن ان پھلوں کو کھاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ بہر حال اس قدر فرض کر لینا جائز ہے کہ جب وہ اس قسم کی اشیاء خریدتے تھے تو کھاتے بھی ضرور ہوں گے۔ القصہ یہ غذا تھی۔ ہمارے "بڑے ماسٹر صاحب" کی!

لیکن سب سے بڑی فضول خرچی جو ماسٹر صاحب گوارا کرتے تھے۔ مکان کے کرایہ کے متعلق تھی یعنی وہ تقریباً عہ/۱۲ اپنے مکان کا کرایہ دیتے تھے۔ ایک کھپریل اُس کے سامنے ۴ گز مربع صحن، معہ ایک بیر کے درخت کے! یہ مکانیت تھی۔ بلاکسی سیاسی یا مذہبی یا معاشرتی تعصب کے آپ غور کریں تو آپکو ماننا پڑیگا۔ کہ مہاتما گاندھی بھی اس سے کم ذاتی خرچ پر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں نے یعنی ان کے شاگردوں نے ماسٹر صاحب کے ذاتی آمد و خرچ کا تقریباً صحیح تخمینہ لگا لیا تھا۔

خرچ		آمد	
شکر	۸/	تنخواہ ماہوار	ماعہ/
آٹا	عا/	بذریعہ پرائیویٹ تعلیم	للعہ/
کرایہ مکان	عہ/۱۲	میزان	مالعہ
متفرقات (جسمیں پارچہ پوشیدنی کی مد بھی شامل ہے)	عہ/		
میزان	۱۲آ/		

پس انداز کا اندازہ؟ ——— آمد و خرچ کی ان تفصیلات کے بعد ضروری نہیں!

اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ اخراجات میں متفرقات کی مد بڑھتی بہت کم تھی اور گھٹتی اکثر رہتی تھی۔ اسی طرح آمدنی میں طلبہ کو پرائیویٹ طور پر سبق پڑھانے کی مد گھٹتی کم تھی اور بڑھتی اکثر رہتی تھی! ———

بہرحال ہمارے ماسٹر صاحب آپ بھی مان لیں گے کہ، تھے بہت ہی عجیب وضع قطع کے آدمی، ان کی تمام ترہیئت معنوی گویا ایک غلاف میں بند تھی اور کوئی شخص ان کی طبیعت اور اس کی کیفیات سے واقف نہ تھا جس طرح اُن کی چھتری یا گھڑی یا عینک ملفوف رہتی تھی۔ اسی طرح وہ گویا ہمہ تن ملفوف تھے صبح ٹھیک ۹ بجے لوگ ان کو معہ اپنی لمبی اور سیاہ اچکن اور متوسط القامت عمامہ کے اپنے گھر سے مدرسہ کی طرف جاتے دیکھتے اور چار بجے گھر کی طرف آتے! قصبہ کے تمام باقی راستے علاوہ اس سڑک کے جوان کے مکان اور مدرسہ کے درمیان تھی۔ ان کے قدموں سے ناآشنا تھے۔ اعزا، دوست، احباب، یار، آشنا ان سب جھگڑوں سے ان کی زندگی پاک تھی ... ... کبھی ان کو کسی نے سواری پر سوار نہیں دیکھا۔ ان کی ٹانگیں اُن کا بوجھ ہر حال اور ہر موسم میں سنبھال لیتی تھیں!

کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان کا وطن کہاں ہے۔ اور وہ اس مدرسہ میں آئے کہاں سے۔ بیس برس ان کو قصبہ میں رہتے گذر گئے تھے۔ اور کیا تعجب کہ جس وقت نئے مدرسہ کی بنیاد کھودی جارہی تھی۔ تو وہ اسی بنیاد میں سے معہ اپنی سیاہ اچکن اور عمامہ کے برآمد ہوتے ہوں اور بجنسہٖ کرسی بچھا کر پڑھانے بیٹھ گئے ہوں ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ علاوہ اچکن اور عمامہ کے ماسٹر صاحب کے پاس ایک بڑا اسوتی رومال بھی تھا۔ کوئی گز بھر مربع۔ جس کے ہر کونے میں کئی کئی گرہیں لگی ہوئی تھیں معلوم نہیں ان گرہوں میں کچھ تھا یا خالی تھیں۔ بہرحال ان کو کبھی کھلتے کسی نے نہیں دیکھا!

ماسٹر صاحب کی رائے میں کوئی امر حرکت یا واقعہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہر چیز کے نتائج سے وہ خائف رہتے تھے۔ اور اُن کی طبیعت کا صرف یہی ایک رُخ کسی قدر بے نقاب تھا۔ ہر معاملہ میں ان پر نفی کا پہلو اثبات سے زیادہ موثر ہوتا تھا۔ ہر چیز کی حلت سے زیادہ اُس کی حرمت پر اُن کی نظر رہتی تھی۔ ہر سفید چیز میں بھی وہ سیاہی کی ایک جھلک دیکھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً مغرب کے بعد اگر اُنہوں نے اپنے کسی شاگرد کو بازار کی طرف جاتے دیکھا تو وہ چلتے چلتے رُک جائیں گے۔ یا اگر اپنے دروازہ پر کھڑے ہیں تو گھبرا کر کواڑ کی کنڈی پکڑ لیں گے۔ اور اپنی دھیمی آواز میں بغیر اضطراری طور پر بار بار فرمائیں گے "نتیجہ بُرا ہے۔ بہت بُرا ہے۔" الفاظ کی فضول خرچی صرف اسی فقرہ تک محدود تھی۔ جو ہر موقعہ پر ان کی زبان سے نکلا کرتا تھا: "نتیجہ بُرا ہے!" اپنی کلاس میں وہ اگر کسی لڑکے کو شرارت کرتے دیکھ لیتے۔ تو جلدی سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کلمہ کی انگلی چھت کی طرف اٹھائی جاتی تھی اور مجرم کی طرف مخاطب ہو کر فوراً فرماتے تھے "نتیجہ بُرا ہے"! اگر کہیں سڑک پر دو آدمی جھگڑا کرتے ہوئے مل جاتے تو وہ چلتے چلتے رُک کر ایک لمبا سانس لیتے اور فرماتے "نتیجہ بُرا ہے!" اگر قصبہ میں کہیں گانے بجانے کی آواز آجاتی یا کسی کے گھر باجہ بجتے سُن لیتے تو "نتیجہ بُرا ہے" کہے بغیر کبھی نہ رہتے۔

یہ ضرور نہیں کہ ان کی اس تنبیہہ کو کوئی سنے بھی۔ اکثر تو وہ اس قدر آہستہ یہ جملہ ادا کرتے تھے۔ کہ شاید اُن کی آواز اُنکی ناک کے طول سے بھی آگے نہ جا سکتی تھی۔

بہرحال نتیجہ کا خوف ان کو ہر وقت ستاتا رہتا تھا۔ اگر ان کے مدرسہ کے کوئی استاد پڑھاتے پڑھاتے منہ کھول کر سو جاتے (جیسا کہ اکثر ہوتا تھا) اور وہ یہ منظر دیکھ لیتے تو ماسٹر صاحب استادِ خوابیدہ کو جگائے بغیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یہ کہتے ہوئے گذر جاتے تھے کہ "نتیجہ برا ہے!" وہ ہر معاملہ میں اس درجہ محتاط تھے کہ اکثر بہت زیادہ غور و خوص کے بعد بھی وہ سوائے اس نتیجہ کے کسی نتیجہ پر نہ پہنچ پاتے تھے کہ "نتیجہ برا ہے"۔ فرض کیجئے کہ ان کے سامنے ایک لڑکا پیش کیا گیا۔ جس نے اپنے استاد کے ساتھ گستاخی کی ہے اب وہ تحقیقات شروع کریں گے:۔

مدعی کہے گا:۔

"اس لڑکے نے میرے ساتھ گستاخی کی، جناب!"

لڑکا کہے گا:۔

"میں نے تو کوئی گستاخی نہیں کی۔ ماسٹر صاحب! میں تو صرف ہنسا تھا۔ مولوی صاحب یہ سمجھے کہ میں اُن کا منہ چڑا رہا ہوں"

"ہوں!" ماسٹر صاحب فرمائیں گے۔

لڑکا اپنی داستانِ غم بیان کرے گا:۔

"مجھے مولوی صاحب نے بہت مارا، جناب! میں پٹتا رہا اور کچھ نہیں بولا"

"ہوں!" ماسٹر صاحب فرمائیں گے۔

مدعی استاد صاحب فرمائیں گے:۔

"نہیں جناب یہ جھوٹا ہے۔ یہ بہت دفعہ اس قسم کی شرارتیں کر چکا ہے۔ سزا ملنی چاہیئے اس کو"۔

"ہوں!" ماسٹر صاحب فرمائیں گے :

مدعی صاحب زور دیں گے :۔

"میری رائے میں تو جناب! اس کو مدرسہ سے خارج کیا جائے"۔

"ہوں!" اور ماسٹر صاحب دفعتہً کھڑے ہو نگے۔ ان کی کلمہ انگلی ملزم کی ناک کے قریب چھت کی طرف سیدھی اُٹھ جائے گی ——— "نتیجہ بُرا ہے بہت بُرا ہے۔ جاؤ!"

یعنی فیصلہ ہو گیا۔ تحقیقات ختم! کیا فیصلہ ہوا، کسی کو معلوم نہیں۔ لڑکا اور اس کے استاد۔ مدعی اور ملزم دونوں بدستور اپنی کلاس میں موجود!

کسی نے ایک دفعہ ماسٹر صاحب کو سمجھایا کہ آپ ٹال جاتے ہیں۔ اور شریر لڑکوں کو سزا نہیں دیتے۔ اِس لئے مدرسہ کا نظم خراب ہوتا جاتا ہے، جب وہ بولنے پر مجبور کر دیئے گئے تو انہوں نے فرمایا :۔

"میں سزا دیتا، اور جو در اصل ہوتا وہ بے قصور؟"

ان سے کہا گیا کہ "جب قصور ثابت ہو جائے تو پھر بے قصوری کا کیا سوال؟"

فرمایا :۔

"امکان تو ہر حال میں ہے نا! عجلت کا نتیجہ بُرا ہے!"

اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں بھی وہ اکثر جایا کرتے تھے۔ لیکن ہوتا یہ تھا۔ کہ دفعتاً دبے پاؤں جیسے اڑتی ہوئی کوئی روح، بے آواز، کسی کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکوں نے ادب سے کھڑے ہوکر سلام کیا۔ وہ چارپائی یا کرسی پر بیٹھ گئے۔ گھنٹہ، دو گھنٹہ بیٹھے رہے۔ بالکل خاموش، اس کے بعد دفعتاً اُٹھے اور چلے گئے۔ اس خاموش ملاقات میں اگر کسی لڑکے نے سوالات کرتے کرتے اُنکو بولنے پر مجبور ہی کر دیا تو اُنھوں نے اس قدر مختصر جواب دیئے کہ آخر گفتگو کے سلسلہ کو شروع ہوتے ہی رنجک چاٹ گئی:

"ماسٹر صاحب! عید کی تعطیل ایک دن کی ہے یا دو دن کی؟"

ماسٹر صاحب نے دو انگلیاں اٹھا دیں:

"ماسٹر صاحب امتحان کس تاریخ سے شروع ہوگا؟"

ماسٹر صاحب نے پانچ انگلیاں دکھا کر زبان سے کہا: "اگست!"

غرضیکہ باوجود شاگردوں کی متحدہ کوششوں کے ماسٹر صاحب اپنی مخففات کی دُنیا سے بہت کم باہر آتے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یوں تو عموماً ماسٹر صاحب ہر قسم کی سواری کے بہت خلاف تھے۔ مگر بائیسکل سے تو گویا اُن کو بَیر تھا۔ اسکول کا ماسٹر یا لڑکا بائیسکل استعمال کرتا تھا۔ وہ اس سے ہمیشہ ناخوش رہتے تھے۔ سڑک پر مدرسہ کے کسی طالب علم کو بائیسکل پر سوار جاتے دیکھتے تو عادت کے خلاف اس کو آواز دے کر روکنے کی کوشش فرماتے:

"چھی چھی، صحت خراب (سینے کی طرف اشارہ کر کے)، کمزور (کمر پر ہاتھ رکھ کر) ٹیڑھی فضول، واہیات، نتیجہ بُرا ہے۔ چھی چھی!"

اس قدر لمبی چوڑی تقریر صرف بائیسکل ہی کے متعلق کیا کرتے تھے۔ ورنہ عموماً اظہارِ ناخوشی کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے بڑے رومال کے کونے کو وہ اپنی ناک پر رکھ کر ایک آواز نکالا کرتے تھے۔ جیسے بند زکام یا نزلہ!

ماسٹر صاحب کو فارسی زبان سے خاص ذوق تھا، حالانکہ خود وہ ہندو تھے۔ اور سنسکرت کے فاضل کہے جاتے تھے۔ اکثر یعنی دو چار مہینہ میں ایک دفعہ ایک خاص کیفیّت ان پر طاری ہوتی تھی۔ اس وقت وہ فارسی زبان میں اپنے مخففات ادا کرنے لگتے تھے:۔

"فارسی —— خوب —— شیریں فصیح (کانوں کی طرف اشارہ کر کے) خوش آیند دانی؟ چہ دانی؟ نمی دانی؟ بلے، بداں (اپنی طرف اشارہ کر کے) دانم، خوب (طالب علم کی طرف اشارہ کر کے) ہیچ —— (منہ بگاڑ لیا —— گویا نمی دانی کا جملہ پورا کر دیا)

اختصار کا لحاظ ہر حال میں رکھتے۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہے کہ کل تعطیل ہو گی تو صرف دو لفظ کہہ دیتے تھے "فردا تعطیل"۔ روپیہ پیسہ کی طرح لفظوں کا اسراف بھی اُن کو بہت گراں گزرتا تھا۔ ہر لفظ جو ان کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گویا اُن کی گرہ سے گیا۔ ان کے نزدیک، بات کرنے میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔

منافع کچھ بھی نہیں! اشد ضرورت سے زیادہ الفاظ خرچ کرتے ہوئے اُن کا دل دکھتا تھا۔ غرضیکہ یہ تھے ہمارے ماسٹر صاحب!

ماسٹر صاحب کی داڑھی میں سفید بال کافی پیدا ہو چکے تھے۔ ان جیسے محتاط اور سنجیدہ آدمی کے متعلق کسی کو کبھی یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن اللہ کا کرنا یہ کہ وہ گرفتار ہو ہی گئے۔ اس گرفتاری کی تفصیل ہماری داستان کا خاتمہ ہے!

برسات کا زمانہ تھا اور ماسٹر صاحب کا مکان تھا بوسیدہ۔ مالک مکان تھا بد معاملہ۔ کم بخت باوجود عہ ماہوار کرایہ وصول کرنے کے مکان کی مرمّت سے ہمیشہ غافل رہتا تھا۔ ایک دن جب ماسٹر صاحب سو رہے تھے۔ ایک طرف کی دیوار آ رہی اور اُس کا کچھ حصّہ ماسٹر صاحب کے اوپر گرا۔ "نتیجہ بُرا" ہونا ہی تھا۔ ماسٹر صاحب کا ایک ہاتھ مضروب ہوا۔ اور اس ضربی کا نتیجہ بھی بُرا ہوا یعنی ماسٹر صاحب اپنی روٹی پکانے سے معذور ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ایک شاگرد نے ماسٹر صاحب کو مزید اخراجات سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے گھر کی ماما بھیجدی، یہ نیک بخت دونوں وقت آ کر ماسٹر صاحب کی ایک روٹی پکا جایا کرتی تھی۔ یہاں تک تو نتیجہ بُرا ہی تھا، "بہت بُرا" نہ تھا۔ لیکن عمر میں پہلی دفعہ صنفِ نازک کا اس صورت میں ماسٹر صاحب کے غریب خانہ میں داخل ہونا غضب ہو گیا! ماما کم بخت بیوہ تھی۔ صرف ۳۰ سالہ۔ صورت شکل کی کافی مناسب!

دو چار دن کے بعد لوگوں نے ماسٹر صاحب کے حالات، عادات اور افعال میں کچھ نئی چیزیں دیکھنی شروع کیں۔ دنیا حیران رہ گئی:-

وہ آنکھوں میں سُرمہ لگانے لگے!

اُن کو بازار میں کنگھی اور ایک آنہ کا چنبیلی کا تیل خریدتے ہوئے دیکھا گیا!

اُن کی داڑھی کے بال منت پذیر شانہ معلوم ہونے لگے!

ایک دفعہ ماسٹر صاحب اسکول سے گھر آتے وقت مسکراتے ہوئے دیکھے گئے!

سارا قصبہ حیران اور پریشان ہوگیا۔ نظریں ہر وقت ان کی طرف اُٹھنے لگیں۔ مدرسہ کے لڑکوں نے تو ایک باقاعدہ صیغہ سراغرسانی قائم کر لیا۔ روزانہ مدرسہ کے اوقات کے بعد اس صیغہ کی رپورٹوں پر گفتگو ہونے لگی:-

"کل شام تو ماسٹر صاحب بازار گئے تھے، سُنا اللّٰو حلوائی کی دکان سے چار آنہ کی مٹھائی اور دو آنہ کا دودھ خریدا تھا!

"آج بلاقی بزاز کی دکان سے ماسٹر صاحب نے چار روپے کی ٹسر خریدی ہے۔"

"صبح کو ماسٹر صاحب نے نائی کو بجائے دو پیسہ کے ایک آنہ دیا! داڑھی بھی کچھ چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔"

اسی قسم کے افکار و حوادث میں ماسٹر صاحب کے شاگرد مبتلا رہنے لگے!!

ایک دن تو قصبہ میں قیامت ہی برپا ہوگئی ——— ماسٹر صاحب اپنے

ایک شاگرد کی مدد سے بائیسکل پر سوار ہونا سیکھتے دیکھے گئے! مدرسہ کے تمام اُستاد پڑھانا اور طالب علم پڑھنا بھول گئے۔ قصبہ کے لونڈے اکثر ماسٹر صاحب ہی کے اردگرد رہنے لگے۔ سب کو انتظار تھا کہ خدا جانے اب کیا ہونے والا ہے۔

تفصیلات پردۂ اخفا میں ہیں مگر کچھ ہوا ضرور! ایک دن دوپہر کو جب ماما روٹی پکانے آئی تو پھر واپس نہیں گئی اور ماسٹر صاحب بھی دو ہی بجے مدرسہ بند کر کے گھر آئے تو پھر دوسرے دن صبح تک باہر نہ نکلے! اُس دن مدرسہ تو کھلا رہا مگر عام تعطیل تھی۔ تمام اُستاد ایک کمرہ میں بیٹھے ہنس ہنس کر کھسر پسر کر رہے تھے۔ لڑکوں کی ٹولیاں باہر میدان میں جگہ جگہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ اُس دن بڑے ماسٹر صاحب ایک خاکی اچکن پہنے باہر تشریف لائے قصبہ کے معمّر لوگ قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ کم و بیش بیس برس کے بعد ماسٹر صاحب نے دوسری اچکن بدلی ہے۔ گویا زمانہ بدل گیا!

ایک ہی مہینہ میں ماسٹر صاحب کچھ سے کچھ ہو گئے۔ تعطیل کے دن وہ اکثر بازار جانے لگے۔ اکثر دکانوں پر خرید و فروخت کرتے دیکھے جانے لگے۔ کبھی دکان پر سُرمہ خرید رہے ہیں۔ کہیں مٹھائی کا دونا رومال میں باندھ رہے ہیں۔ کہیں زنانہ پاجاموں کا کپڑا خریدا جا رہا ہے۔ کسی جان پہچان کو دیکھا، ہنس دیئے "آداب عرض" اور "مزاج شریف" تک نوبت پہنچنے لگی۔ "نتیجہ بُرا ہے۔" تو

وُہ بھول ہی گئے۔ گویا سلیٹ کا لکھا مٹا دیا! کوشش کرتے تھے کہ یہ تکیہ کلام زبان پر نہ آنے پائے۔ پھر بھی کبھی کبھی ایک دو لفظ زبان سے نکل ہی جاتے تھے!!

"دیکھو جی! تم سبق یاد کر کے نہیں آتے ــــ نتیجہ۔۔۔۔"

"تم بہت شریر ہو گئے ہو جی ــــ نتیہ۔۔۔۔"

"غیر حاضر بہت رہنے لگے تم ــــ نت۔۔۔۔"

اب "نتیجہ بُرا ہے" کی یہ صورت رہ گئی تھی!

گفتگو میں کُچھ تحکم کی شان پیدا ہوتی جاتی تھی۔ لہجہ میں وُہ نرمی اور گھبراہٹ اور خوف باقی نہ تھا۔ پُرانی "وضع احتیاط" بھی کم ہو چکی تھی! اب وُہ کھل کر باتیں کرنے لگے تھے اور ایسے ایسے موضوع پر اُن کی زبان کھلتی تھی جس کا کبھی سُننا بھی گوارا نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ مدرسہ کے جن ماسٹروں کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ان سے مُسکرا مُسکرا کر فرمانے لگے تھے:۔

"عزیز! ہر کہ زن ندارد آسائش تن ندارد"

زن اور آسائشِ تن کا فلسفہ اب ماسٹر صاحب کی سمجھ میں آنے لگا تھا!

کوئی شریر نوجوان ماسٹر جواب بھی چبھتا ہوا دے دیتا تھا۔

"اجی کیا کہتے ہو!" بڑے ماسٹر صاحب چمک کر فرماتے "نتیجہ دنتیجہ کیا، ذرا کر تو لو شادی!"

غرض یہ کہ بڑے ماسٹر صاحب کا تجرد رخصت ہوا تو اپنے ساتھ ان کی قدیم اداؤں کا پشتارہ بھی باندھ کر لیتا گیا!

ماسٹر صاحب کی شادی کو کچھ کم تین مہینے گذر گئے۔ ایک دن خلافِ معمول ماسٹر صاحب مدرسہ نہیں آئے۔ شام کو مدرسہ کے دو تین اُستاد اور چند طالب علم ماسٹر صاحب کے مکان پر گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر چارپائی پر ماسٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی اہلیہ موجود نہ تھیں۔ ماسٹر صاحب کچھ پریشان حال معلوم ہوئے مزاج پُرسی کے جواب میں اُنہوں نے پھر قدیم اختصار سے کام لیا۔

"بیمار —— (سر پر انگلی رکھ کر) درد!"

یہ آخری دیدار تھا جو لوگوں کو عرصہ تک یاد رہے گا۔ اس کے بعد ماسٹر صاحب لاپتہ ہو گئے۔ نہ معلوم کہاں گئے۔ دو تین دن بعد ان کا مکان خالی پڑا تھا۔ ان کے پلنگ پر ان کا بستر بدستور پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک پرانا لوٹا رکھا تھا۔ ماسٹر صاحب کا صندوق کھلا پڑا تھا۔ اُس میں دو جوڑے کپڑے بھی کھلے پڑے تھے۔ پانی پینے کا گلاس بھی طاق میں رکھا تھا!

کچھ عرصہ تک وُہ مکان ان کے شاگردوں اور ہموطنوں کی زیارت گاہ بنا رہا اور ماسٹر صاحب کے انجام کے متعلق جتنی زبانیں تھیں، اتنی ہی باتیں مشہور ہو گئیں۔ کوئی کہتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی اہلیہ ان کی تمام پونجی لے کر فرار ہو گئیں

اور اس صدمہ کی حالت میں ماسٹر صاحب نے خودکشی کر لی۔ کوئی کہتا تھا کہ ماسٹر صاحب اپنی اہلیہ کی فراری سے شرما کر روپوش ہو گئے۔ کوئی کہتا، ماسٹر صاحب زندہ ہیں۔ اُنہوں نے بمبئی میں دوکان کر لی ہے۔ غرض ہر شخص اپنی عقل لڑاتا تھا۔ مگر پتہ کسی کو نہ تھا کہ وہ گئے کہاں، مر گئے یا زندہ ہیں؟ ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ اس نے اپنی شادی کے دن ماسٹر صاحب کو خواب میں دیکھا۔ وہی اچکن، وہی عمامہ، وہی چھتری، کلمہ کی انگلی اُٹھی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ ہونٹ ہل رہے تھے۔ کان لگا کر (شاگرد کہتا ہے) میں نے سُنا تو فرما رہے تھے کہ "نتیجہ بُرا ہے۔"

فریب

زمانہ :- جنگ یورپ

مقام :- فرانسیسی محاذ جنگ کے عقب میں ایک چھوٹی سی بستی- اس بستی میں ایک کرایہ کے مکان کا معمولی کمرہ-

وقت :- شام

کمرہ میں ایک نوجوان فوجی افسر اور ایک حسین لڑکی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے داخل ہوتے ہیں- لڑکی آتش دان میں آگ روشن کرتی ہے- دو کرسیاں کھینچکر آتشدان کے آگے لیجاتی ہے ——— فوجی افسر کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے- پھر دریچہ کا

پردہ گرانے لگتی ہے۔ پردہ گراتے گراتے ہاتھ روک لیتی ہے اور باہر کی طرف میدان میں غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے ـــــ نوجوان افسر آگے بڑھکر اس کے کاندھے پر ایک اندازِ محبت کیساتھ ہاتھ رکھدیتا ہے

"ہاں! تو تم نے بتایا نہیں، تم آخر رو کیوں رہی تھیں"

"رہنے بھی دو! وُہ بات ہی کیا تھی، جو میں بتاؤں، غروبِ آفتاب کا نظارہ اکثر روح پرور ہوتا ہے اور جو نظارہ روح پرور ہوتا ہے۔ وُہ کبھی کبھی آنسو بھی پیدا کرتا ہے اور نہیں تو یوں سمجھ لو کہ عورت کے آنسو عموماً بے معنی ہوتے ہیں"۔

"یہ کیونکر؟ ایسا تو نہیں ہے، مجھ سے پوچھو تو میری رائے میں عورت کا رونا قانوناً ممنوع ہونا چاہیئے (ایک مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ) تلوار کے دھنی، میدان کے سورما! تمہارے لئے قانون ایک لفظِ بے معنی ہے۔ پھر اس کا ذکر کیا ـــــ ہنستے رہو، میں بھی ہنسوں تم بھی ہنسو، تم اس لئے کہ دُنیا چند روزہ ہے اور کل پھر تمہیں میدانِ جنگ میں جانا ہے اور میں اس لئے کہ تنہا ہوں، بے یار و غمخوار! اور مجبور! ہنسنے کی کوشش نہ کروں تو روتے روتے مرجاؤں!"

"ہاں! تو رونے ہنسنے کے فلسفہ کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم کہاں میدانِ جنگ کے اس قدر قریب آکر پھنس گئیں اور پھر اس تکلیف دہ اور شرمناک زندگی میں؟"

"جی ہاں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے! ـــــ کیا تم زخمی ہونے پر محاذِ جنگ سے ہٹائے گئے تھے؟"

"آج ہی تو ہسپتال سے چھٹکارا ملا ہے"۔

"توبہ! پناہ بخدا! کیا قیامت ہے یہ جنگ! ساری دُنیا کو دوزخ بنا دیا"۔

"خدا جانے کب ختم ہو گی ——— یہ تو بتاؤ تم کس قوم کی لڑکی ہو، اور کس ملک کی رہنے والی ہو"؟

"میں؟ ——— میں؟ (کچھ گھبرا کر) بس تم یہ سمجھ لو کہ میں روسی ہوں ———"

"روسی! بھلا تم کہاں سے کہاں پہنچ گئیں؟ مجھے تو آج تک کبھی کسی روسی حسینہ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خوب ملیں آج! دُنیا کس قدر تنگ ہے (نوجوان کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا) "تم مجھے بہت ہی پیارے اور معقول آدمی معلوم ہوتے ہو! بہت سے مرد ملتے ہیں ——— جوانی کے دیوانے ——— بے مروت، بے پروا، سنگدل، پر تمہارا دل تو مجھے نرم معلوم ہوتا ہے! کیا سچ مچ تم ایسے ہی نیک خصلت ہو؟ کیا سچ مچ؟ یا یہ بھی ایک دھوکہ ہے۔ ایسے دھوکے بیسیوں خندق اور ہسپتال سے فرصت پا کر میری گود میں آتے ہیں۔ فریبی، خود غرض ——— سب کے سب!

(مسکرا کر)، فریبی، خود غرض ——— مرد"!

"بھولی بھالی چھوکری! تو نے مرد کی معنوی زندگی کا مطالعہ ہی نہیں کیا! خندقوں میں جا کر دیکھ۔ کس طرح موت کے کھلے ہوئے مُنہ میں ہنستے کھیلتے جاتے

ہیں! اور ہنس ہنس کر لاکھوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں! جھوٹ کہتا ہوں ہاں؟"

(لڑکی کے رخساروں پر آہستہ سے انگلی مارتے ہوئے)

"بیوقوف چھوکری! اتنا نہیں سمجھتی کہ جو کوئی اپنی موت سے کھیلتا ہے۔ وہ دوسروں کی موت پر کیوں نہ ہنسے؟"

"ہاں ہاں! سچ کہتے ہو ——— موت سے کھیلنے والے، موت پر ہنسنے والے! (طنز کے لہجہ میں) کس قدر سچ کہتے ہو۔"

"تمہیں یقین نہیں آتا؟ جس معرکہ میں میں زخمی ہوا، اس معرکہ میں میری پلٹن کے ہر سپاہی نے مجھ سے بڑھ چڑھکر دادِ شجاعت دی۔ جس طرح وہ دشمن کی طرف بڑھے، جس طرح انہوں نے اپنے سروں کو ہتیلیوں پر رکھ لیا ——— واللہ! کیا عجب سماں تھا!"

"مگر ——— برا نہ مانیو ——— دشمن کی فوج کے سپاہی بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھتے ہوں گے ——— وہ بھی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتے ہوں گے ——— اب کوئی کیا جانے کس کی بہادری اور شجاعت حق بجانب ہے۔"

"ہاں! یہ تو ممکن ہے۔ دشمن بزدل تو نہیں ہے ——— البتہ اصلی وجۂ تفوق حق و باطل کا صحیح امتیاز ہے ———"

"حق و باطل ، حق و باطل ؟ (جوش بھری آواز میں) نسبتی مصطلحات! لغت کا فریب! زبان کا مکر! ——— حق دونوں طرف پکارا جا رہا ہے۔ جس کو میں کہوں وُہ بھی حق ، جس کو تم کہو وُہ بھی حق! یہ تمام معیار خود ساختہ ہیں ——— سُنا تم نے ؟ ——— سب غلط ہیں ——— جو جیتے گا ، جو زیادہ خون پی سکے گا ، وہی حق پر رہے گا!! ———"

"کیا باؤلی باؤلی باتیں کر رہی ہے ننھی گلہری! آ ، کچھ عشق و الفت کی بات کر! حق و باطل کا فیصلہ مردوں پر چھوڑ دے جن کے بازوؤں میں طاقت ہے!"

"مغرور مرد! (مسکرا کر) تم اپنی فوج میں افسر ہونا ، دماغ یا دل کی وجہ سے نہیں ، صرف قوتِ بازو کی وجہ سے! تمہارا ——— تم مردوں کا تفوق کس قدر مادی اور جسمانی ہے ——— روحانی نہیں ہے ——— نہیں ہے! ——— سمجھے تم؟"

(مسکرا کر) حسین عورت کا زنانہ فلسفہ حسین ہوتا ہے مگر کس قدر ہلکا ——— بے ثبات!

——— خیر جانے دو! یہ تو بتاؤ کیا تم یہاں بالکل تنہا مقیم ہو۔ کوئی بھی تمہارا ہم وطن روسی یہاں نہیں؟"

(لڑکی کے چہرے پر تردّد اور گھبراہٹ کے آثار نظر آتے ہیں ——— کچھ جھجکتی ہے ، پھر دفعتہً کہتی ہے)

"میرے ہم قوم، ہم وطن روسی، روسی میرے ہموطن" (یکایک کچھ سنبھل کر) مجھے تنہائی کی فکر نہیں۔ جب محاذ پر گولہ باری ہوتی رہتی ہے تو ہسپتال کے مریضوں اور زخمیوں کا دل بہلایا کرتی ہوں اور جب گولہ باری کا زور کچھ کم ہوتا ہے تو خندقوں میں گھس جاتی ہوں۔ سپاہی میرا گانا سنتے ہیں، مجھے گود میں بٹھاتے ہیں۔ اُن کے بارود سے سیاہ ہاتھ میرے بالوں اور رخساروں سے کھیلتے ہیں —— اگر تم جیسا کوئی افسر مل جاتا ہے تو وہ اس کمرہ میں چند گھنٹے میرے ساتھ گذارتا ہے، صبح کو، شام کو، رات کو، جب ساری فضا توپوں یا طیاروں سے گونجتی ہوتی ہے، میں کسی فوجی سورما کے تھکے ہوئے اعصاب کو تسکین دیتی ہوں —— نہ کہو گے مجھے ہمدردِ بنی نوعِ انسان"

"تب تو تم خاصا کما لیتی ہو گی"

"خاصا! —— بہت خاصا!! —— آج بھی یہ دیکھو۔ بارہ آنے میری جیب میں ہیں!"

(لڑکی کو پیار سے اپنی گود میں کھینچکر)

"بس یہ ساری پونجی ہے تیری؟ اپنی زندگی اس قدر سستی بیچ رہی ہے تو؟ اس قدر سستی؟"

"مگر یہاں تو زندگیاں، جانیں، روحیں اس سے بھی زیادہ سستی بک رہی ہیں، بازار کا بھاؤ بہت گرا ہوا ہے —— اے میرے تیغ زن!"

ایک دو روبل کی بارود میں بیسیوں جانیں خریدی جاتی ہیں اور فروخت کی جاتی ہیں! ——"

"بڑی چیز ہے —— یہ جنگ! —— مگر —— بہت بُری چیز ہے فرضِ منصبی! سپاہی کسی کا دُشمن نہیں مگر کرے کیا —— فرضِ منصبی اس کا خدا ہے۔ قہار اور جبار اور قادرِ مطلق!! اس خدا سے وُہ روگرداں نہیں ہو سکتا! —— تمہارے ملک میں —— روس میں —— تو بُرا حال ہے۔ سنتے ہیں۔ کبھی تمہیں اپنے عزیزوں کی بھی خبر ملتی رہتی ہے؟"

"عزیز، یعنی ماں باپ بھائی؟ —— کوئی باقی نہیں —— سب اُتر گئے موت کے گھاٹ! میرا رشتہ بس اب میرے ان عاشقوں سے قائم ہے جو سامنے خندقوں میں مقیم ہیں! مگر وُہ بھی ہر روز مرتے ہی رہتے ہیں اور میں ہر روز بیوہ ہوتی رہتی ہوں، مگر دولھا بہت ہیں، شب بھر کے دولھا —— اور عقد صرف ایک آنکھ کے اشارے سے تکمیل پاتا ہے! اس لئے مجھے ماتم کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا!"

(لڑکی خوب ہنسی اور ہنستے ہنستے نوجوان کی گود میں لوٹ گئی۔

—— پھر وُہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ اُٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے)

میں عروسِ مشترک ہوں، میں فوج کی دلہن ہوں۔ کوئی مجھے یاد نہیں رکھتا

سب مجھے شب بھر پیار کرتے ہیں ——— اور صبح کو بھول جاتے ہیں۔ ——— خدا جانے کس دن گرفتار کر کے بند کر دیں گے۔ جب مجھ سے تھک جائیں گے تو کہیں گے یہ عورت تو جرمن جاسوس ہے ——— پھر ایک دن صبح کو کسی دیوار سے مری کمر لگی ہو گی اور دس بارہ رائفل میرے سینہ پر آگ اُگل رہے ہوں گے۔ ایک لمحہ کا یہ سب تماشا ہو گا ——— بس!"

"تو کیا تم جرمن ہو؟ تم تو کہتی ہو تم روسی ہو۔"

(لڑکی کی آنکھوں میں عجیب چمک ہے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بندھی ہوئی ہیں ——— وہ سینہ نکالے کھڑی ہے)

"جرمن! ہاں جرمن! تو کہہ دیا میں نے!!"

دیکھو نا! چہرہ بدل گیا تمہارا!! ابھی تم میرے عاشق تھے اور ابھی اتحادی فوج کے افسر بن گئے!! عاشق سپاہی کی وردی میں غائب ہو گیا!! کس لو اپنی پیٹی! لیچلو مجھے پکڑ کے!"

(افسر گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی ہے ———)

"آہستہ آہستہ! خدا کے لئے آہستہ! عورتوں سے مرد نہیں لڑا کرتے۔ مجھے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ———"

"مگر فرضِ منصبی ——— مگر فرضِ منصبی! اس دیوتا کی قربان گاہ پر اس

زنگینِ تغیری کو چڑھادو! اپنے حبِ وطن کو اس عورت کے خون سے تازہ کر لو! بڑا نام ہوگا تمہارا!"

"کیا اس لئے، صرف اس لئے کہ تو بیگانہ قوم کی عورت ہے؟ یہ تو نہ ہوگا۔ میں اتحادیوں کی فوج کا سپاہی ضرور ہوں مگر قوم اور وطن کے امتیازات سے آزاد ہوں۔ جرمنوں سے لڑتا ہوں، اس لئے کہ سپاہی ہوں اور میرا فرضِ منصبی یہی ہے لیکن قوم اور وطن کا تعصب میرے نزدیک انسانیت کی نفی ہے، بہت ادنیٰ درجہ کی وحشیانہ بُت پرستی ہے! "انسانیت" کے جھنڈے کے نیچے وطن اور قوم کے امتیازات اُسی سزا کے قابل ہیں جو جاسوس کو دی جاتی ہے۔ سمجھیں تم؟ تمہارا راز میرے دل میں محفوظ رہے گا ـــــ مگر خدا کے لئے نقارے نہ بجاؤ!"

"تو کیا تم انسانیت کو وطنیت پر فائق سمجھتے ہو! یہ ایمان ہے تمہارا؟ یہی ایمان ہے میرا! کیسی ہے یہ تفریق! کیسا نفرت انگیز ہے یہ امتیاز! لعنت ہے قوم پرستوں اور وطن پرستوں پر ـــــ لعنت ہے!! انسانیت کے دشمن! لعنت ہے، بیشک لعنت ہے ـــــ آدمیت کے منکر! صلیب اور مسیح اور خدا! وطن اور قوم اور نسل! ـــــ کچھ نہیں! کچھ بھی نہیں! دھوکہ ہے سب! فریب ہے سب، اصل ایک تھی ـــــ مگر جغرافیہ اور تاریخ اور سیاست نے ٹکڑے کر ڈالے ـــــ یہ کالا اور گورا، یہ بھورا، یہ مشرقی، یہ مغربی!! تُف ہے! تُف ہے!"

"تُف ہے! تُف ہے!!"

"مگر (مسکرا کر) بھٹکی ہوئی، بہکی ہوئی چھوکری! قوم و ملت کے تخیل پر تو بھی کہتی ہے تُف! اور میں بھی کہتا ہوں تُف! مگر —— مگر —— کچھ مقاصد ہیں جن پر میں —— اتحادی —— ایمان رکھتے ہیں اور جن کے لئے ہم لڑ رہے ہیں"

"کیا مقاصد؟ یہ مقاصد کہ اس جنگ کے بعد دُنیا کے حالات بہتر بنا دیئے جائینگے زندگی کی منزلیں انسانوں کے لئے آسان کردی جائیں گی —— یہ مقاصد! تم یہ کہتے ہو. تمہارے دشمن بھی یہی کہتے ہیں اور شروع سے آج تک جتنے لڑنے والے لڑے —— قوم کا نام لیکر، یا وطن کا نام لے کر، یا مذہب کا نام لیکر —— سب نے یہی کہا —— مگر ہوا کیا، دُنیا بد سے بدتر ہوتی گئی اور جس کا بازو قوی تھا، حق اُسی کے ساتھ رہا!! غنیمت ہے کہ ہم کو، تم کو ایک دفعہ مر کے پھر واپس نہیں آنا —— بہت غنیمت ہے ورنہ آج سے زیادہ دُنیا کو بدحال پاتے!!"

(افسر کے چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ وُہ مضطرب ٹہل رہا ہے)

"بس اب جاؤں گا —— ٹھہر نہیں سکتا —— مجھے روکو نہیں پھر ملوں گا کسی دن فرصت میں ——"

"یہ معلوم کر کے کہ میں جرمن ہوں تم کو مجھ سے نفرت ہوگئی کیا؟ میں نہ کہتی تھی"!

"نہیں نہیں! میں نے کہدیا کہ وطن و قوم کے متعلق میرا دل اُن ادنےٰ جذبات اور تعصبات سے پاک ہے —— بالکل پاک ہے، مگر مجھے شب میں

کچھ قیدیوں کو لے کر جانا ہے ـــــ"

"قیدی! جرمن قیدی؟"

"ہاں! جرمن قیدی، کیا تمہارا کوئی عزیز بھی قید ہوا ہے؟"

(لڑکی کے چہرہ پر انتہائی دلچسپی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں)

"کیا خبر، لیکن بتاؤ تو قیدیوں کی حالت کیا ہے، ہیں تو سب اچھی طرح؟"

یکایک مکان کی دیوار کے نیچے ایک اخبار فروخت کرنے والا لڑکا آواز لگاتا ہے:۔

"شام کا تازہ پرچہ ـــــ اتحادیوں کی عظیم الشان فتح ـــــ جرمنوں کی شکست ـــــ دو ہزار قیدی ـــــ جرمن محاذ ٹوٹ گیا ـــــ"

دونوں دروازے کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایک ایک پرچہ دونوں خریدتے ہیں۔ اور دونوں الگ الگ کرسیوں پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

نوجوان افسر کا چہرہ چمک رہا ہے، وہ بار بار ہر خبر کو پڑھتا ہے۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے پھر اخبار پڑھتا ہے۔ پھر ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک دفعہ بے اختیار مسکراتا ہے:۔

"کیا خوب! کیا کارِ نمایاں کیا ہمارے جنرل نے! واہ کمال کر دیا! واللہ! بدمعاشوں کو کیا سزا دی ہے، یہ محاذ ٹوٹ گیا تو پھر برلن تک راستہ صاف ہے

—— زندہ باد برطانیہ —— زندہ باد قوم برطانوی!"

لڑکی دریچہ کے پاس کھڑی اخبار پڑھ رہی ہے۔ اس کا چہرہ مغموم ہے

"دو ہزار قیدی! اور خدا جانے کتنے مجروح اور مقتول! اے اللہ! رحم کر میری قوم پر! میرے وطن پر! خیر خیر، ابھی کیا ہے، دیکھا جائیگا! دیکھا جائیگا! ابھی میرا وطن ایسا بیدم نہیں ہوا ہے —— دیکھنا —— دیکھنا —— شیرِ برطانیہ کی کھال نہ کھینچ لی تو —— زندہ باد جرمنی!"

دونوں اپنے اپنے زاویۂ نظر سے باطل کے مقابلہ میں حق کا بول بالا کر رہے تھے! اور چند ہی منٹ پہلے یہ دونوں قوم و نسل کے امتیازات اور تعصّبات سے کس قدر آزاد تھے!!

حُبِّ وطن کا فریب!!

انسانیت کی موت!!

(گالزوردی کا ایک عکس)

میں اکیلا ہوں

اندھیری رات، طوفانی سمندر۔ ٹوٹی ہوئی کشتی، ساحل بہت دور، انسانوں کی بستیاں بعید اور موجوں کے بے پناہ طمانچے! موجوں کو خبر ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ میری زندگی اور میری موت کے درمیان حدِ فاصل معدوم! موت کو بھی خبر ہے کہ میں اکیلا ہوں!!

اس سفر میں کوئی "شجر سایہ دار" بھی مسافر نواز نہیں ہیں اکیلا ہوں — اور میرے سر پر آسمان ہے۔ سمندر کی وسعت لا انتہا۔ گہرائی بے پایاں۔ آسمان کا پھیلاؤ بے حد — موت کا ہاتھ لانبا! خبر نہیں کل صبح میری آنکھیں سورج کی روشنی دیکھ سکیں گی یا اُن کا نور بھی فنا ہو جائیگا۔ موت کے انتظار نے —

میں کچھ خوف ہے اور کچھ شوق —— اُن عزیزوں کی یاد کو بھی دل سے مٹا دیا ہے جو ساحل کے کنارے عافیت میں بیٹھے ہوئے میرے لئے آنسو بہا رہے ہوں گے! اس آخری شب میں میرا مونس و رفیق ان ستاروں کی جھلک کے سوا کوئی نہیں جو آسمان کی چادر پر بکھرے ہوئے مری کشتی کو موجوں پر اچھلتے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا نور یک گونہ مسافر نواز ہے!

نامہ و پیام کی تمام راہیں بند ہیں۔ مگر شب تار کی ٹمٹماتی ہوئی یہ آنکھیں کوئی پیام مجھے دے رہی ہیں۔ رحمت اور شفقت کی خنکی اس پیام میں ہے اور امیدِ فردا!

آسمان کی اس ننھی فوج کا سردار چاند، گویا سمندر سے نہا کر نکل رہا ہے۔ اُس کی کرنیں موجوں پر لوٹ رہی ہیں۔ اسی طرح جس طرح میری کشتی۔ مگر اُس کی آنکھوں کا نور ستاروں کی طرح متحرک نہیں۔ میرے لئے اُس کے پاس کوئی پیام۔ کوئی اشارہ نہیں۔ شاید اُسے معلوم بھی نہیں کہ میری کشتی اُس کے نور میں غرق ہے!

آفتاب! وہی جس کو کل شام تک میں دیکھتا رہا۔ اُسی سمندر کے پانی میں غرق ہوا تھا —— کہیں اندر چھپا بیٹھا ہوگا! وُہ تو کل ہی مجھ سے کہہ گیا تھا کہ اب تیری صورت نہ دیکھوں گا —— صبح وُہ جب نہا دھو کر سمندر سے نکلیگا تو میں اپنا آخری غسل کر چکا ہوں گا!

ماہتاب اجنبی ہے۔ سورج خفا ہے! سمندر کلیجے سے لگا لینا چاہتا ہے۔ رفتہ وُہ بھی نہیں۔ اُس کے پیٹ میں آگ لگی ہے!!

شب کی چند ساعتیں باقی ہیں۔ وہی ٹوٹی ہوئی کشتی میں ایک ٹوٹا ہوا دیا جل رہا ہے۔ ہوا اس کو گل نہ کر سکی۔ موجیں اس کو بجھا نہ سکیں۔ اُس کا فانوس اُس کو بچائے ہوئے ہے۔ وُہ نورانی تیتلیوں کے ایک قفس میں رکھا ہوا ہے۔ بہت سی آندھیاں اُس پر گذر چکی ہیں۔ جب میری کشتی اس قدر کمزور نہ تھی تو میں نہ کبھی سُورج کی پروا کرتا تھا نہ چاند کی۔ میرا چراغ سات سمندروں میں میرے لئے کافی ہوتا تھا ابھی وہ روشن ہے ـــــ اس آخری شب میں! صبح جب پُرانی تتلیوں کا فانوس ٹوٹ جائیگا تو ہوا کا ایک آخری جھونکا اُس کے نور کو اپنے پروں پر لپیٹ کر نہ جانے کہاں لے جائے گا! کیا معلوم! شاید میں بھی ـــــ وُہ "میں" جو میرے اندر ہے وہ بھی ـــــ اسی نور پر ان کے ساتھ سمندر کی موجوں کے آغوش سے نکل کر ہمیشہ کے لئے وہاں چلا جائے۔ جہاں نہ سُورج ہے نہ چاند نہ تارے، نہ طوفان، نہ موجیں! اُس سکونِ مطلق میں!!

موتی کے آویزے

کپتان ناکامورا ــــــ شہنشاہ کی فوج کے اُس دستے کا کمانڈر، جس نے حال ہی میں نانکنگ فتح کیا تھا۔ بڑا ہی بہادر آدمی تھا۔ مگر مہینوں تک فوجی زندگی کی مصروفیتوں نے اُسے تھکا ڈالا۔ وہ اُکتا گیا تھا۔ ایک دن اُس نے سوچا کہ میں اب تھک گیا ہوں، مجھے تھوڑے آرام، تھوڑے عیش کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ میں پندرہ دن کی رضا حاصل کر کے شنگھائی چلا جاؤں۔

بہادر کپتان کے لئے چین کے اِس قدیم اور بوسیدہ دارالسلطنت میں اب یہ فوجی زندگی بے نمک اور بے مزہ ہوتی جاتی تھی۔ یہاں نہ تو شنگھائی جیسے طرب انگیز چار خانے تھے جہاں وہ اپنے بھاری فوجی جوتے اُتار کر بیٹھ سکتا۔ یا جہاں اُس کو

پچیز کے لیے لطیف اور پُرکیف "سوکیاکی" "ساکی" یا "گیشا" میسر آسکتی۔ نہ یہاں وہ دلفریب موسیقی تھی جو اُس کے عیش پسند جذبات کو بیدار رکھ سکتی۔ کچھ بھی نہ تھا نانکنگ کے اِس ویرانہ میں! جب سے جاپانی فاتح اس شہر میں آئے حسین اور کم عمر چھوکریاں تو اِس درجہ کمیاب ہو گئی تھیں کہ گویا اِس شہر کے گھروں میں لڑکیاں پیدا ہی نہیں ہوتیں! لعنت اس شہر پر! جہاں ایک بھی نظر نواز چھوکری میسر نہ آئے! پھر بتایئے کہ شہنشاہ کے فوج کے بہادر اور فرض شناس سپاہی کیا کریں آخر؟ یہ بے نمک زندگی کب تک؟ کپتان ناکامورا کے تصوّر میں شنگھائی کی راتیں بس رہی تھیں۔ شانگھائی کی وہ رنگین صحبتیں، زندگی کے وہ رنگین خواب، چارخانوں کی وہ راتیں، جن میں آنکھ بند کرنا گناہ تھا، وہ راتیں، حسن اور موسیقی کے ایک کیف لازوال سے معمور، وہ راتوں کا جاگنا اور دن کا سونا۔ تاریک راتوں کی منوّر صحبتیں جن کے بعد دن کے سورج کا منہ دیکھنا حرام ہو! بہادر کپتان اپنی تصورات کی دنیا میں شنگھائی کے عشرت خانوں کی کیا کیا دل افروز تصویریں بنا رہا تھا۔ اُس نے کہا مجھے جانا ہی چاہیئے۔ یہ خون کو ٹھنڈا کرنے والا بدبخت نانکنگ!

نانکنگ سے شانگھائی جانے والی اکسپریس میں یہ چار فوجی افسر تھے۔ جو اوّل درجہ کے ایک ڈبہ میں آٹھ گھنٹہ تک ہمسفر رہے۔ وہ سب اپنے اپنے خیالات میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ اُس سارے سفر میں شاید آدھی درجن الفاظ

بھی اُن میں سے کسی ایک نے دوسرے سے نہیں کہے۔ ریل گاڑی کے دریچوں سے وہ باہر کے دوڑتے ہوئے مناظر کو اس طرح دیکھ رہے تھے۔ کہ جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں خشک کھیت، اجڑے ہوئے سبزہ زار، مسمار اور برباد آبادیاں اور شہنشاہ کی فوج کے روندے ہوئے شانگھائی کے لق ودق میدان! ــــــــ شمالی اسٹیشن پر یہ تینوں مسافر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اُن کے عیش کی راہیں جدا جدا تھیں!

کپتان ناکامورا اسٹیشن کی عمارت سے جھومتا ہوا نکلا۔ وہ کیسے بھول جاتا کہ وہ "نکلتے ہوئے سورج" کی اولاد ہے۔ اور ابھی ابھی نانکنگ فتح کر کے آیا ہے۔ اسٹیشن کے باہر ایک رکشا کے اونگھتے ہوئے چینی قلی کو اُس نے ٹھوکر مار کر جگایا۔ فاتح کے غرور کی ساری قوت اس ایک ٹھوکر میں تھی۔ رکشا میں بیٹھ کر اس نے حکم دیا "چاپو روڈ" قلی نے بغیر کچھ کہے سلام کیا۔ "وہ محض قلی" فاتح کی ٹھوکر سے سرفراز ہونے کے بعد اور کیا کرتا سوائے سلام کرنے کے ــــــــ

چاپو روڈ کی ایک دوکان کے سامنے رکشا ٹھیر گئی۔ کپتان نے دوکان کے دروازہ پر کھڑے ہو کر تانبے کے چار چھوٹے چھوٹے سکّے قلی کی طرف پھینکے۔ قلی نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کپتان کے تیور دیکھ کر اُس نے اپنے ان چار چھوٹے چھوٹے سکّوں میں فوجی جوتے کی ایک اور ٹھوکر کا اضافہ پسند نہ کیا اور اپنے نشانوں کو پھڑکاتا ہوا خالی رکشا لیکر چلدیا۔

یاباشی کے خاندان میں کپتان کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ "فوجی" کے بھرے ہوئے پیالے اور سبز چائے کا سماوار عزیز مہمان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ گرم حمام اس کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ اس جاپانی گھر کے سب بچے بہادر کپتان کی زبان سے جنگ اور فتح کی باتیں سننے کے لئے بے چین تھے۔ بہادر کپتان نے پہلے غسل کیا۔ پھر سبز چائے کی دو چار پیالیاں پئیں۔ اور پھر بچوں کو فتحمند جاپانی فوج کے کارناموں کی کہانیاں سناتے ہی سناتے خراٹے لینے لگا۔ اس کی نیند دنیا کے افکار سے فراغت اور یکسوئی کی گہری نیند تھی۔

دوسرے دن دوپہر کو ایک نئی وردی پہن کر کپتان اس گھر سے نکلا۔ اور سیدھا ونگ می تنگ کے گھر آیا۔ ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ یہ مسٹر ونگ کون تھے۔
مانچو حکومت کے زوال کے بعد یہ صاحب ایک چینی سیاست پیشہ امیر کے چھوٹے بیٹے تھے جس کو کپتان ہی نے کسی نہ کسی طرح شنگھائی کی کونسل کا رکن بنوا دیا تھا۔ ونگ صاحب سیاست اور تجارت دونوں میں ہیٹے تھے۔ نہ ان میں روپیہ کمانے کی قابلیت تھی اور نہ اعلیٰ سیاست کے مسائل کو سمجھنے کی۔ دماغ بہت چھوٹا سا تھا عیش پسند تھے اور عیش بھی مہنگا پسند کرتے تھے۔ سنہ ۳۷ء میں جب جاپانیوں نے اس علاقہ پر قبضہ کیا تو ونگ اپنے باپ دادا کی ساری دولت ختم کر چکا تھا۔ اس کا بڑا مشغلہ مہاجنگ تھا۔ تین تین دن تک مسلسل وہ مہاجنگ سے جوا کھیلتا رہا کرتا

تھا، یا جب وہ اس شغل سے اُکتا جاتا تو امراء کے کلب میں اپنی راتیں گذارتا۔ جنسی نعیش کی پرشور راتیں! حُسن اور شراب کی راتیں! یہ تھا مسٹر ونگ۔ اب وہ جاپانیوں کے محکمہ جاسوسی سے اپنی خدمات کا گراں قدر معاوضہ حاصل کرتا تھا۔ جس دِن اُس نے اپنی قوم کے خلاف یہ خدمات انجام دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی تو اس کے ضمیر پر دو طرف سے چوٹ لگی تھی۔ ایک طرف غداری کی شرم اور دوسری طرف اس غداری کی سزا کا خوف، مگر شرم کے احساس کا مقابلہ ونگ کے لچکدار ضمیر نے کیا۔ وہ اب عرصہ ہُوا کہ شرم کی حدود سے گذر چکا تھا۔ البتہ خوف کانٹے کی طرح اُس کے دل میں چبھا کرتا تھا۔ یہ خوف کہ وطن پرست چینی اپنی قوم کے غداروں کی خدمت میں لوہے کی گولی اور خنجر کی دھار پیش کیا کرتے ہیں۔ بہت دنوں خوف اور ہوس کی یہ کشمکش جاری رہی۔ بہت دنوں وہ خوف کے پسینہ کو ہوس کے تقاضوں سے خشک کرتا رہا، مگر خوف اور ہوس کے اس مقابلہ میں ہمیشہ ہوس ہی کامیاب رہی۔ اِس لئے کہ جب کبھی خوف کروٹیں لیتا تو دو ہزار ڈالر ماہوار کی آمدنی کا خیال اُس کو تھپک تھپک کر سلا دیتا۔ ان دو ہزار میں سے ہر ڈالر کیساتھ ونگ حسن و عیش کے خواب دیکھتا تھا۔ اِسی لئے تو اُس کے ہر قدم پر ڈالر جیتتا اور خوف ہارا ————

جاپانی فوج کے افسر اکثر اس کے پاس آیا کرتے تھے اور اکثر وہ ان افسروں کے ہاتھ اس علاقہ کی چینی حکومت کے اندرونی حالات فروخت کیا کرتا تھا۔ اس

دن رات کی عیش کوشی کا تھکا ہوا ونگ آرام کر رہا تھا جب اُس کے ملازم نے کپتان ناکا مورا کا کارڈ پیش کیا۔ یہ کپتان کم بخت کیوں آیا؟ ونگ نے سوچا۔ یا تو دوسرے جاپانی افسروں کی طرح خوش گپیاں کرنے اور محض میری چاء اور میرے سگریٹ پینے آیا ہے اور یا ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات کہے۔ ایسی بات جسمیں مجھے سو پچاس ڈالر کا نفع ہو جائے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کپتان اپنی نئی وردی اور اپنے چمکتے ہوئے فوجی جوتے پہنے ہوئے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔

اِس ملاقات میں گرمجوشی نہ تھی۔ مگر ظاہری اخلاق بہت تھا۔ کپتان اپنے دل میں کہہ رہا تھا "مردود چینی کتا" "معلوم نہیں اس نے کتنا روپیہ کمایا ہوگا۔ ونگ دِل میں سوچ رہا تھا" بدمعاش جاپانی" معلوم نہیں کس فکر میں آیا ہے۔ بظاہر اس طرح باتیں ہو رہی تھیں کہ گویا وہ دونوں بہت ہی پرانے دوست ہیں۔

اقبال ہند اور بہادر جاپانی فوجوں کے کارنامے چند یوم کی اِس "رضا" میں عیش کوشی کے اڈے، ہوٹلوں اور چاء خانوں کا تذکرہ جہاں اچھی اچھی چھوکریاں مل سکتی ہوں یا جہاں اچھی شراب میسر آسکتی ہو ـــــ باتیں اِس طرح ہو رہی تھیں۔ مگر ونگ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ ابھی اس مردود نے مطلب کی بات نہیں کی اور کپتان سوچ رہا تھا "کہوں یا نہ کہوں؟ ایسا نہ ہو یہ زرد چوہا انکار کر دے۔ انکار کیا اگر اس نے تو اسکا مزاج بھی آج درست کر دونگا"۔

ونگ نے اپنے گدے پر پہلو بدلا ـــــ کپتان نے اپنی پیٹی میں دو انگلیاں ڈال کر ایک لمبا سانس لیا۔ ونگ کے ملازم نے دونوں کے درمیان چاء کی پیالیاں اور مٹھائی

کی طشتریاں رکھ دی تھیں۔ کپتان نے مٹھائی کا ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے بے پروائی کے انداز میں کہا۔

"مسٹر ونگ، ایک ذرا سا معاملہ ہے۔ اگر اجازت ہو تو کہوں۔"

"بیشک، فرمایئے کپتان صاحب" ونگ نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے کہ میرے پاس دو عدد اچھی قسم کے موتی ہیں۔ ذرا آپ ان کو دیکھ لیجئے شاید آپ کو پسند آ ئیں۔"

"بہت خوشی سے، بہت خوشی کے ساتھ" ونگ نے کہا۔

مگر ونگ قدرے بےچین ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسی کم بخت کی مدد سے تو خفیہ پولیس کے اس عہدہ پر میرا تقرر ہوا تھا، اب ضرور یہ اپنی اس امداد کا معاوضہ لینے آیا ہوگا۔ یوں تو نقد رقم مانگے گا نہیں، مگر مجھ سے کچھ نہ کچھ وصول کرنے کی کوئی صورت ضرور سوچ کر آیا ہے! اپنے جھوٹے موتیوں کی قیمت سو ڈالر مانگے گا اور جو میں نے انکار کیا تو؟... ونگ کو وہ جاسوس یاد آیا جسکو کسی نے دس دن ہوئے ایک اندھی گلی کے اندر گولی مار دی تھی۔

کپتان نے اپنے کوٹ کے دو بٹن کھولے اندر کی جیب سے ایک بٹوا نکالا۔ اس نے بٹوے کے اندر سے ایک ڈبیا نکالی اور ڈبیا کا ڈھکنا کھول کر ونگ سے کہا۔

"ذرا دیکھئے مسٹر ونگ۔ کیا بے نظیر موتی ہیں یہ۔ آپ تو دیکھئے ان کی آب!" ونگ نے دیکھا ایکدفعہ اُس کے چہرے کا رنگ پیلا، پھر سرخ پھر پیلا ہو گیا مگر اتنی جلدی کہ کپتان ان بھاگتے ہوئے رنگوں کو دیکھ نہ پایا۔ ونگ کے ہاتھ میں وہ کھلی ہوئی ڈبیا تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کہیں

وہی آویزے تو نہیں جو چند روز پہلے میں نے اپنی پیاری بلبٹی کو دیئے تھے جو نانگنگ کی فتح کے بعد سے لاتے ہیں ؟ پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا، نہیں نہیں، یہ موتی وہ نہیں ہیں، خدا جانے کہاں سے لئے ہونگے اس مردود نے، ونگ سوچ یوں رہا تھا اور کہہ یہ رہا تھا " کپتان صاحب آویزے تو بہت اچھے ہیں، موتی بہت آبدار ہیں۔ کیا آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں ان کو ؟ "

" کیا قیمت دیں گے آپ ؟ " کپتان نے سوال کیا۔

" اے جناب مال تو آپ کا ہے قیمت بھی آپ ہی بتائیے نا "۔

مگر کپتان نے وہ آویزے خریدے تو نہ تھے۔ اس لئے ان کی قیمت بھی اُس کو معلوم نہ تھی۔ تاہم اس کو تو کسی بہانہ ونگ کی جیب میں ہاتھ ڈالنا ہی تھا۔ اُس نے کہا۔

" دس ہزار ڈالر "۔

ونگ نے حیران ہو کر منہ کھولدیا پھر بند کر لیا۔ پھر کھولدیا۔ اُس کی آنکھیں کبھی بند ہو گئیں اور کبھی مٹمٹائیں۔

" دس ہزار ! دس ہزار "! پھر آہستہ سے اپنے سر کو جھکاتے ہوئے اُس نے کہا۔

" دس ہزار۔ اُفوہ ! ——— موتی اچھے ہیں مگر سو ڈالر سے زیادہ کے نہیں " کپتان اس جواب کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

" کیا کہا آپ نے ؟ سو ڈالر ؟ یعنی صرف سو ڈالر ؟ اگر یہ موتی محض موم یا سیپ کے ہوتے تو بھی تو پانچسو ڈالر سے کم کے نہ ہوتے۔ ونگ صاحب ! یہ کیا کہہ گئے آپ ؟ آج صبح ہی تو میں نے ایک جوہری کو دکھائے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ ان کی قیمت دس ہزار ڈالر سے ایک پیسہ

کم نہیں، بلکہ اگر ذرا گول ہوتے تو پندرہ ہزار ڈالر میں بھی سستے تھے۔ اور صاف کہہ دوں نو ہزار تو میرا ایک اور دوست اب دینے کو تیار ہے، مگر میں نے سوچا کہ آپ ان چیزوں کے قدر دان ہیں۔ مسٹر ونگ۔"

بڑی مہربانی کپتان صاحب" ونگ نے کہا، "مگر میرے پاس اتنی رقم نہیں آپکو زیادہ ضرورت ہو تو ہزار دو ہزار تک حاضر کر سکتا ہوں"۔

"نو ہزار!" کپتان نے کہا۔ "جائیے میں ایک ہزار چھوڑ دیتا ہوں"۔

"آپ نے ایک ہزار کم کر دیئے تو پھر آپ کیا یاد کیجیئے گا؛ چار ہزار پر مجھے یہ سودا منظور"

"اجی مسٹر ونگ! مطلب یہ کہ گویا آپ مجھے مایوس واپس کرنا چاہتے ہیں! اجی؟"

کپتان کے ان الفاظ میں التجا اور خواہش کم تھی۔ تعریف اور دھمکی زیادہ تھی۔ ونگ نے کپتان کے ڈنک کی خراش محسوس کی۔

بہت اچھا کپتان صاحب! آپ کی خاطر پانچ ہزار حاضر کرتا ہوں۔ بس اب مان ہی جائیے۔" ونگ نے مسکرا کر کہا اور مٹھائی کی ایک طشتری کپتان کی طرف بڑھا دی۔ آدھے راستہ پر یہ دونوں دوست مل گئے! ونگ نے سوچا غنیمت ہے کسی طرح جان تو چھوٹی، یہ کم بخت آج بغیر لئے ٹلنے والا نہ تھا۔ کپتان نے اپنے دل میں کہا۔ جو چیز مفت ملی تھی۔ اُس کے پانچ ہزار بھی کیا بُرے ہیں۔

"اچھا لائیے۔ پانچ ہی سہی۔" کپتان نے کہا، "مگر نقد دیجیے"۔

ونگ نے کہا، "بھئی معاف کرنا، گھر میں اتنی رقم موجود نہیں۔ کل جہاں کہو پہنچا دوں"۔

ایک دو پیالیاں چائے کی۔ دو چار دانے مٹھائی کے۔ دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں شہر کی حسین چھوکریوں کے تذکرے، شراب خانوں کی نئی نئی ترغیبات کے قصّے۔ اور اور بالآخر طے ہوا کہ ونگ کل شام کو جاپانی رقص خانہ کے ایک کمرہ میں کپتان صاحب کے ساتھ رات کا کھانا کھالے اور رقم ادا کر کے آویزے حاصل کرے۔

رات بھر رقص کے خلوت خانہ میں حُسن اور شراب کے ہنگاموں سے تھک کر جاپانی فوج کا یہ سورما صبح ہوتے سویا تھا۔ وہ دن بھر سوتا رہا۔ اور جب سہ پہر کے زرد روآفتاب کی کرنیں شہر پناہ کی پہاڑیوں کو مس کر رہی تھیں —— تو وہ انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہوا۔

—— شب گذشتہ کی پُر کیف تھکن اتر چکی تھی۔ اور آنے والی رات کے لئے وہ تازہ دم ہو چکا تھا ——

"سنہری کوکنار" نامی شراب خانے میں کافوری بتیاں روشن ہو چکی ہیں اور کپتان کھانے کی چٹائی پر بیٹھا ہوا ونگ سے باتیں کر رہا ہے کھانے میں ابھی دیر ہے۔ مگر دو بہترین قسم کی جاپانی شراب حاضر ہو چکی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شرابخانے کی دو نہایت حسین اور نظر نواز چھوکریاں بھی مہمان داری کے فرائض انجام دینے کے لئے حاضر ہیں۔

کپتان نے تالی بجائی "بنیان، بنیان!" ایک چھوٹی سی چھوکری نے سر

جھکا کر اشارہ کیا۔ کپتان نے کہا۔

"منیان! اچھی تیز لاؤ، جو خوب تیز ہو۔ ہاں جانِ من! یہ جو تم لائیں یہ تو بہت ہلکی ہے۔ ذرا تلخ بھی ہونا چاہیئے۔"

کھانا اب شروع ہو گیا تھا۔ تخت پر گیس کے دو چولھے رکھ دیئے گئے تھے۔ چھوکریاں گوشت کے پتلے پتلے ٹکڑے ان چولھوں پر بھون رہی تھیں۔ مرغی کے چھوٹے چھوٹے پارچے ایک دوسرے برتن میں دم دیئے جا رہے تھے۔ مچھلی کے جاپانی کباب تلے جا رہے تھے اور یہ دو عجیب دوست کھانا کھا رہے تھے۔ ڈنگ سوچ رہا تھا۔

اب یہ مردود مجھ سے روپیہ مانگیگا ——— پانچہزار ڈالر! افوہ! کپتان سوچ رہا تھا۔ اب بدمعاش ڈنگ سے روپیہ لیکر اس کو چلتا کرنا چاہیئے۔ پانچہزار! مگر ہیں کیا یہ پانچہزار شنگھائی کی دلفروز راتوں میں، کل جس چھوکری سے وعدہ لیا تھا۔ اب آتی ہی ہوگی وہ۔ مگر کم بخت شراب نہیں پیتی۔ یہ بڑا عیب ہے۔ یہ بدبخت روپیہ دیکر جاتا کیوں نہیں۔ کیا رات خراب کریگا میری ———"

ڈنگ سوچ رہا تھا۔ اور اگر نہ دوں۔ صاف کہدوں کہ یہ موتی میرے کام کے نہیں۔ اور جو اس بدمعاش نے چینی حکومت کو خبر کر دی کہ میں جاسوس ہوں۔

کپتان دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ "اگر ذرا محبت کی اِس نے۔ اگر پانچ کے چار بتائے۔ تو پھر میں نے کیا اِس کا مزاج درست ———

ایساکہ یاد کرے۔"

اِن دو دوستوں کی پُرلطف صحبت کئی گھنٹے جاری رہی۔ اس لئے کہ نشہ تیز ہو چکا تھا۔ اور جب وہ تیز ہوجاتا ہے تو وقت بھی اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے پھر انتہا یہ ہوتی ہے کہ لٹّو کی طرح وقت اِس قدر تیز گھومنے لگتا ہے کہ گویا سو جاتا ہے۔ اِس شب کو شنگھائی کے اِس شراب خانے میں اِن دو دوستوں کے درمیان کھانا مزے کا تھا شراب اس سے زیادہ پُرکیف اور شراب سے زیادہ پُرکیف دو حسین چھوکریاں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت دوڑتے دوڑتے ٹھہر گیا ہے! کائنات اِن دو شرابیوں اور چھوکریوں کے سوا کچھ بھی نہ تھی!

مگر نہ جانے کیوں ونگ اس شب کو حُسن کے کرشموں سے کچھ زیادہ متاثر نہ تھا۔ شراب کا مزہ بھی اُس کے منہ میں تلخ تھا۔ کپتان کے رندانہ اقدامات میں ونگ کے قدم کچھ پیچھے پڑ رہے تھے۔ ناکام ورا کے معدے نے اب اس کے منہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ہوس کے تقاضے اب صرف شراب ہی پر اکتفا کرنے لگے تھے۔ کھانا اٹھا لیا گیا۔ چھوکریوں کو اشارہ ہوا کہ وہ جائیں ——— ونگ کی طبیعت موزوں نہ تھی اور کپتان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہوٹل کی چھوکریاں "سست" ہوتی ہیں! اُن کا حسن اداکار نہیں ہوتا۔ وہ کہہ رہا تھا" دوست ونگ' ہوٹل کی یہ چھوکریاں ایسی ہوتی ہیں جیسے ہوٹل کا بستر! ——— نرم اور ٹھنڈا! وہ چھوکری

ہی کیا جو یہ مستیوں کا جواب نہ دے سکے کیوں ڈنگ؟ بات پتہ کی کہی میں نے!"
——کپتان اب آدھے سے زیادہ مخمور ہو چکا تھا مگر نہ اتنا کہ شنگھائی کے بہترین قسم خانہ کا راستہ بھول جاتا! وہ اب دوآتشہ "ساکی" کی ترنگ میں نانکنگ کی فتح کا قصہ اور اپنے کارنامے بیان کرنے لگا۔
"ونگ یار تم دیکھتے جس دن میں نے نانکنگ فتح کیا ہے!" اس نے اپنی ٹانگیں ونگ کی طرف پھیلا دیں۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ پہلے اس سے کہ میں رات کے مشغلہ سے رجوع کروں۔ اس چینی کتے کو ذرا مرعوب تو کر دوں۔
"ہاں یار ونگ!" —— اُس نے کہا۔ "بس کچھ نہ پوچھو دوست، وہ دن ہی عجیب تھا۔ ہمارے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ لیکن جب میں نے شہر کے دروازہ پر اپنی بندوق کا کندا مارا اور میرے سپاہیوں نے اُسکے کواڑ توڑ ڈالے اور ہم شہر کے اندر داخل ہوتے تو ہمارا سیلاب اُس کی آبادی پر اس طرح گذر گیا۔ جیسے کھیت کاٹنے والی برقی مشین۔ جو سامنے آیا۔ بچہ۔ بوڑھا۔ عورت ککڑی اور مولی کی طرح کٹتا چلا گیا ——!
ڈنگ نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے کپتان۔ وہ دن تو یادگار رہے گا۔"
"یادگار! ارے دوست بس یہ سمجھو ان چینی کتوں کو کاٹتے کاٹتے بازو شل ہو گئے اور تلواریں کند ہو گئیں۔ آخر ہم نے بھی لگا دیں مشین گنیں کہ وقت کیوں ضایع ہو۔ اِس طرح مارا جیسے کتے کے پلوں کو، ایک ہی بار میں سو سو دو دو سو ——

وہ چیخ پکار کہ توبہ توبہ! مگر ونگ دوست بہادروں کے ہاتھ ہو تلوار اور خون ہو گرم تو بس مرنے والوں کی چیخیں بھی کانوں کو اس طرح نوازتی ہیں۔ جیسے موسیقی۔ تم اگر سپاہی ہوتے تو میری بات کو سمجھتے!"

"واقعی؟ اُس وقت تو ہر سپاہی فتح کی خوشی میں مست ہو گا۔" ونگ نے کہا۔

"مست اچھی مستی کا وقت تو رات کا تھا۔ وہ رات تم دیکھتے! وہ رات، وہ چراغاں دس دس کو باندھ کر ہم نے تیل چھڑکا اور دیا سلائی دکھادی! مگر جب آگ تیز ہوئی تو اُن کی چربی کی بدبو سے دماغ اڑنے لگا ——

—— میں تو کوئی بیس گز کے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بدبو کہ توبہ توبہ ——"

—— مگر اب ونگ خاموش تھا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکا! بد تمیز چینی کتے!

"ارے پی۔ ارے بھر لے پیالہ۔ ایک ہی دفعہ تو زندہ رہنا ہے۔ ونگ! دوست منہ نہ بناؤ۔ یہ رات تو عیش کی رات ہے۔ ہے نا ونگ؟"

ونگ مسکرایا۔

"تو کپتان دوست! تم رات بھر قیدیوں کو جلاتے ہی رہے یا کچھ اور بھی؟"

"کچھ اور! کچھ اور کی بھی خوب کہی! واہ بے احمق! رات بہت لمبی تھی۔ کوئی سپاہی کیوں کر سوتا بغیر ایک عورت کے۔ اور پھر افسروں کو تو بہترین چھوکریاں درکار تھیں۔ جی ہاں بہترین بلکہ بالکل کنواری۔

"تو پھر تم نے تو کوئی بہت ہی اچھی چھوکری ڈھونڈھ نکالی ہو گی؟ کیوں

کپتان؟ تمہارا جیسا سُنہرا مذاق۔"

"میرا مذاق! تم جانتے ہو ونگ! ایسی ویسی عورت کے تو میں پاس بھی نہیں جاتا۔ تمہارے سر کی قسم! اُس رات تو ایسی چھوکری ملی کہ کبھی خواب وخیال میں بھی نہ ملی تھی ——— مگر بڑی ضدی تھی کم بخت! بڑی ہی ضدی!"

کپتان نے ایک اور پیالہ بھر لیا۔

"ارے کیا بتاؤں یار گھس گئے ایک گھر میں کہتے ہیں کہ کسی سوداگر کا وہ گھر تھا۔ جتنی عورتیں دیکھیں، سب کی سب بوڑھی چڑیلیں! لیکن ایک کونے میں چھپی ہوئی ملی ایک چھوکری۔ بس کوئی پندرہ برس کی۔ چاند کا ٹکڑا۔ ونگ یار! وہ گھر والی چڑیلیں بہت چیخیں چلائیں۔ مگر میرے ساتھ تھے بارہ سپاہی۔ اُن چڑیلوں کو تو کیا ٹھنڈا، اور پھر یار میرے! میں تھا اور وہ چھوکری۔ تیرے سر کی قسم رات بھر صبح تک ہاں دس بجے دن تک!

——— آنکھیں بھوری بھوری۔ رنگ ایسے جیسے تازہ بادام ——— مگر بڑی ضدی۔ بڑی ضدی! مجھے رشوت دینی چاہی اُس نے، اپنے کانوں کے دونوں آویزے اتار کر دیئے، وہی جو تم نے خریدے ہیں ——— بیوقوف چھوکری وہ سمجھی کہ میں بھی کوئی موم کی ناک ہوں۔ میں نے کہا، آویزے تو بغیر دیئے بھی میرے ہی تھے۔ میرا خراج تو کوئی اور ہی موتی تھا ——— یہ موتی میں نے اُسکے دیئے ہوئے لے لئے اور وہ موتی ——— سمجھے نا ونگ؟ وہ موتی میں نے زبردستی حاصل

کیا۔ ہا! ہا! ہا! ———

——— بہرحال ہائے وہ رات! اگر کم بخت چھوکری مر نہ جاتی! اچھا لو یار

تو تم لو اور اب لاؤ میرے دام۔"

ونگ کے زرد چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی، اُس نے مسکرا کر اپنے کرتے کے

اندر ہاتھ ڈالا اور یکایک وہ چیخا: "لے! یہ لے! اپنے دام۔"

——— ایک خنجر ونگ کے ہاتھ میں چمکا اور کپتان کے سینے میں پیوست ہو گیا

چھوکری کے اس جاپانی فاتح کے ہونٹوں سے ایک آہ بھی نہ نکل سکی۔

اس دن کے بعد ونگ جاسوس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں کھو گیا۔

عرصہ ہوا، ماڈرن ریویو میں ایک چینی فسانہ نگار کا یہ فسانہ پڑھا تھا، تصور

اُس کے ہیں، الفاظ میرے ہیں!

محمد شریف عباسی

۴۴ ۴